دل کی آنکھ سے

Zhob
Qila Abdullah
Pishin
Qila Saifullah
Musa Khel
Ziarat
Quetta
Loralai
Sibi
Barkhan
Mastung
Kohlu
Chagai
Bolan
Kalat
Dera Bugti
Jhal Magsi
Nasirabad
Jafarabad
Kharan
Khuzdar
Panjgur
Kech
Awaran
Gwadar
Lasbela

خورشید مستوئی

بلوچ کیس

دل کی آنکھ سے

خورشید مستوئی

مہردر انسٹیٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن
پی او بکس 26، کوئٹہ، بلوچستان

انتساب

دنیا بھر کے مظلوموں اور محکوموں کے مشترکہ احساس کے نام

فہرست

حادثاتی پیش لفظ

نوٹ: یہ ایک حادثاتی پیش لفظ ہے، جو مصنف کی مرگِ ناگہانی کے باعث، اس کے ایک فکری وارث کو ذمہ داری نبھانے کے بطور لکھنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے اسے کوئی باضابطہ پیش لفظ نہ سمجھا جائے؛ اور اسی لئے اس میں ربط وضبط کے فقدان کو بھی نظرانداز کرنا چاہئے۔

ہمارے ایک کمیونسٹ بزرگ نے فرمایا: ''کمیونسٹ واقعی بڑے لوگ ہوتے ہیں!'' ان کی یہ بڑائی کسی پیری، مریدی کے طور پر نہیں ہوتی، نہ کسی اعلیٰ عہدے سے، یہ بڑائی تو اُن کے عمل میں ہوتی ہے، اُن کے قول میں ہوتی ہے، اور فعل میں ہوتی ہے۔ یہ کتابچہ اس کی چھوٹی سی مثال ہے۔ یہ ایک ایسے ہی اچھے، اور صاف ستھرے کمیونسٹ کے افکار کا آئینہ ہے، جو عہدِ جوانی میں ہی اپنے قافلے کے ساتھیوں کو سوگوار چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

خورشید مستوئی بلوچستان کے ایک دُور افتادہ قصبہ میں پیدا ہوئے، جیکب آباد میں پلے بڑھے، ٹنڈو جام سے اعلیٰ تعلیم پائی، حیدرآباد اور کراچی میں ملازمت کی، کچھ عرصہ جعفرآباد اور کوئٹہ کے کوچہِ صحافت میں گزارا۔ نسلاً بلوچ، جغرافیاً سندھی تھے، اس لئے ان کی تحریریں سندھ، بلوچستان کی ازلی دوستی کا مرقعہ بن گئیں۔ کوئٹہ میں صحافت کے دوران اُن کی وابستگی قوم پرست رجحان کے حامل روزنامہ 'آساپ' سے رہی۔ سوشلسٹ فکر سے وابستہ آدمی تھے، اس لئے قوم دوستی اور وطن دوستی ان کی نظریاتی فکر کا حصہ تھی، بلوچستان تب سے عالمی سیاست کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ اکبر بگٹی کا قتل ابھی

تازہ تھا، مزاحمتی تنظیموں کا دور دورہ تھا، بلوچ سیاست لکھنے پڑھنے والوں کا مرکزِ نگاہ تھی۔ مارکس کے پیروکار اس جوان نے بلوچ کیس کو دل کی آنکھ سے دیکھا اور 'قوم پرست'، 'انتہا پسند'، 'نسل پرست' جیسے کسی سطحی الزام کی پرواہ کیے بغیر اپنے ذہن اور ضمیر کی آواز کے مطابق لکھا، اور خوب لکھا۔ 'دل کی آنکھ سے' کے عنوان سے 'آساپ' میں متواتر دو برس تک شائع ہونے والے ان کے سیکڑوں کالموں کی دیگ سے چنے گئے یہ محض چند چاول، بطور نمونہ پیش ہیں، اس سے آپ ان کی پختہ فکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں، محکوموں کے حق میں ایک سوشلسٹ اور کمیونسٹ کے زاویہ نظر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خورشید مستوئی رشتے میں میرے ماموں ہی نہ تھے، استاد بھی تھے، جنہیں میری اس نافرمانی کا قلق بھی رہا کہ میں نے انہیں کبھی باضابطہ استاد تسلیم نہ کیا۔ مجھے مطالعے کی جانب رغبت دلانے جیسے مقصدِ حیات کی جانب لے آنے والے اس شخص سے واقعتاً میرے اختلافات رہے۔ شدید اختلافات...... فکری طور پر ایک ہی راہ کے مسافر ہونے کے باوجود میں انتہائی لا ابالی مزاج رہا، بے ڈھنگا پن آج بھی مجھے بھاتا ہے، مستقل مزاجی (معاملاتِ دوراں سے لے کر انتخابِ جاناں تک) مجھے اُکتا دیتی ہے، نت نئے تجربے اور نئی راہوں کی جستجو آج بھی مجھے کچھ نیا کر دکھانے پر اکساتی رہتی ہے...... اور وہ اس کے عین متضاد مزاج کے حامل تھے: انہیں قائدہ قرینہ بہت بھاتا تھا، اصول وضوابط کے آدمی تھے، زندگی کو اصولوں سے ناپ تول کر گزارنے والے۔ اب کیا پردہ کہ ان کا مضمون 'رشتوں کا کوئی امتحان نہیں ہوتا!' مجھ پر ہی لکھا گیا تنقیدی، تاثراتی اور السیاتی مضمون ہے۔ لیکن اسے پہلی بار بھی میں نے ہی تب بنا ایڈٹ کیے شائع کیا تھا، جب میں 'آساپ' کا ادارتی صفحہ دیکھتا تھا اور اب بھی بنا کسی ترمیم کے اسے اس کتاب کا حصہ بنا رہا ہوں۔ ایسا نہیں کہ مجھے اپنی رسوائی کی تشہیر کا شوق لاحق ہے، یوں ہے کہ اپنے تنقیدی مزاج کے باعث میں نے خود پر ہونے والی تنقید کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے؛ ماسوائے اِس کے اُس میں اوچھا پن نہ ہو۔ وہ تو پھر سلجھے ہوئے مزاج کے آدمی تھے، اس لئے ان کی تنقید میں بھی سلجھاؤ کا احساس ہوتا تھا۔ وہی میرے سب سے قدیم، اولین اور باقاعدہ ناقد تھے۔ ان کی بے وقت کی موت نے مجھے اندر سے سوگوار کیا، کہ میں نے اپنا سب سے قدیم، اولین اور باقاعدہ ناقد بہت جلد کھو دیا۔

وہ خود مسلسل حوادث کا شکار رہے۔ لیکن تمام تر ناکامیوں کے باوجود سماج کو اپنی منطق کی عینک سے دیکھنے کی روش ترک نہ کی۔ ایسا نہ تھا کہ ان کا یہ رویہ لاشعوری تھا، بلکہ وہ نہ صرف اپنے اس رویے اور اس کے اثرات تک سے آگاہ تھے۔ اپنے اسی مضمون میں انہوں نے خود لکھا؛

''ہم نے یہ تو جان لیا کہ دوست اپنی ذات کی پرچھائی یا سوچ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی نہیں ہوتا' پھر بھی اندر میں ایک دبی خواہش ضرور موجود تھی کہ ہمارے حلقے میں جو بھی شریک ہو وہ ہمارے محدود دائروں میں اس طرح مقید ہو جائے کہ دنیا کو ہماری نظر سے دیکھے اور ہماری فکر سے سوچے۔ ہم آہنگی کے اس شوق نے ہمیں تنہائیوں کی تاریکیوں میں مزید غرق کر دیا۔ زندگی کے سفر میں سیکڑوں لوگ ہم سفر ہوئے۔ ہم نے ہر ایک کو اپنے معیار سے پرکھا اور اس پیمانے پر پورا نہ پا کر ہم نے تعلق ترک کر دیا اور دوستی نہ نبھانے کے قصوروار ٹھہرے۔''

اور یہی خود آگاہی ہے کہ وہ اس پر نہ پریشان ہوتے ہیں، نہ پشیمان!

''انسان اگر اپنی سوچ میں پختہ اور ارادوں میں مضبوط ہو تو انفرادی رویے کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنتے' ہاں تمام قریبی لوگوں کو اپنا عکس بنانے کی خواہش شاید انسان کو تنہا کر دیتی ہے' اس لئے تمام رشتوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر جہاں تک وہ آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں انہیں قبول کر لینا چاہئے کیونکہ رشتے تو جلتی ہوئی گیلی لکڑی ہیں جو نہ مکمل جلتی ہے اور نہ بجھ جاتی ہے' بس اس سے ہر وقت دھواں اٹھتا ہی رہتا ہے۔ اب پیار کے پانی سے آپ اس آگ کو جتنا ٹھنڈا کر سکتے ہیں کوشش کرتے رہیں' اس امید کے ساتھ کہ رشتوں کے مابین سچائی' اعتماد' عزت واحترام ہر زمانے میں قائم رہے۔''

(''رشتوں کا کوئی امتحان نہیں ہوتا'')

سچائی' اعتماد' عزت واحترام ......یہی تو نیک انسانوں کے گُن ہوتے ہیں، یہی تو اچھے کمیونسٹوں کی پہچان ہوتے ہیں۔ اس آدمی نے سچائی' اعتماد' عزت واحترام کو محض رشتوں تک محدود نہ رکھا بلکہ یہی عناصر ان کی تحریروں کا بھی مرکزی موضوع ہیں۔ وہ بلوچستان کے کیس کو دیکھتے دل کی آنکھ سے ضرور ہیں، لیکن سوچتے دماغ ہی سے ہیں، اس لئے نتائج مرتب کرنے میں مدلل ہیں۔ بلوچ اور وفاق کے مابین تنازعے کو جس سچائی کے ساتھ مختصر و جامع انہوں نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے، وہ ہمارے سیاسی رہنما کئی تقریروں، اخباری بیانوں اور ٹیلی وژن کے ٹاک شوز میں واضح نہیں کر سکے۔ صرف ایک چھوٹی سی مثال دیکھتے ہیں؛

''اسلام آباد سے مختلف ناموں اور حوالوں سے لوگ آتے ہیں، ہمارے بارے میں ایک نقطہ نظر طے

کرکے آتے ہیں اور اپنے دل کی بات ہمارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔ خاطر خواہ جواب نہ پا کر ہمیں جاہل و نااہل قرار دے کر واپس چلے جاتے ہیں جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے درد کو ہم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اسلام آباد والے جس مقام پر کھڑے ہو کر ہمیں دیکھتے ہیں، وہاں سے ہماری تصویر انہیں کبھی بھی درست نظر نہیں آئے گی۔ انہیں اپنی نظر کا زاویہ بدلنا ہوگا۔''

(''ہر فن مولا ہی بے فن ہوتا ہے'')

لیکن اس واضح زاویہ نظر کے لئے تو سچائی درکار ہوتی ہے، خلوص چاہئے ہوتا ہے، اپنائیت اپنانا پڑتی ہے، وطن دوست ہونا ہوتا ہے، بااخلاق بننا پڑتا ہے، انسان بننا ہوتا ہے، سوشلسٹ بننا ہوتا ہے...... تبھی سارے جہاں کا درد آدمی اپنے جگر میں محسوس کرتا ہے۔ خورشید مستوئی چونکہ خود ان خوبیوں سے مزین تھے اس لئے ان کی تحریریں آپ کو ہر مظلومیت کے حق میں، اور استحصال کے خلاف سراپا احتجاج نظر آئیں گی؛ مظلومیت کہیں بھی ہو، استحصال کسی بھی نوعیت کا ہو۔ اس لئے محض بلوچستان کے سیاسی مسائل ہی نہیں، بلکہ کوچہ صحافت کے نظاروں سے لے کر، این جی اوز کے مکروہ چہرے سے پردہ ہٹانے تک، اساتذہ کے مسائل ہوں کہ تعلیمی انحطاط پزیری کا قصہ، ماہی گیروں کے مسائل کا تذکرہ ہو کہ مستقبل کے معماروں کا قضیہ...... ان کا قلم کہیں بھی مصلحت کی چادر اوڑھے بغیر آزادیِ اظہار کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شہید نزیر عباسی سے لے کر، شیخ ایاز اور احمد فراز تک، استحصال کے خلاف لڑنے والے قافلے کے ہیروز کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہتے۔ .... سو، آخری دم تک ثابت قدمی کے ساتھ اسی قافلے کی ہمراہی اختیار کیے رہنے پر، اب انہیں خراج پیش کرنا، ہمارا فریضہ ٹھہرا۔

فرائض کی ادائیگی میں، سستی، کاہلی اور بے سمتی کی ماری ہماری نسل کا ریکارڈ کچھ اچھا نہیں۔ اس کا ایک ثبوت خود یہ کتاب ہے؛ جس کا مسودہ تدوین کے لئے میں نے مصنف کی جدائی سے محض ایک ڈیڑھ ماہ قبل ہی ان کے حوالے کیا تھا۔ ان کا وعدہ تھا کہ علاج سے واپسی کے فوری بعد آ کر وہ پہلی فرصت میں اسے دیکھیں گے اور کانٹ چھانٹ کے بعد اشاعت کے لئے بھجوا دیں گے۔ لیکن علاج کے لئے جانے والا ہمارا یہ جواں ساتھی، ہماری بے اعتنائیوں سے اس قدر متنفر ہوا کہ جہاں سے لوٹ کے آنے کا کوئی امکان نہ تھا، وہیں چلا گیا.......... ساری ذمہ داریاں سستی،

کاہلی اور بے سمتی کی ماری ہماری نااہل نسل کے ناتواں کندھوں پر ڈال کر......!!

ہم ان کی فکر سے ہی اپنی سستی اور کاہلی پر قابو پا کر سمت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں......ان کے افکار کو پھیلا کر ان کے فکری قافلے کو آگے بڑھانے کا عزم کرتے ہیں......ان کے تنقیدی مباحث کو کتابی صورت میں محفوظ کر کے، انہیں ان کے دوستوں کے درمیان تابندہ رکھنے کی کاوش کرتے ہیں......اور جب ان تک ہماری یہ کوشش، عزم اور کاوش پہنچیں گے تو وہ ان پر بھی کیسی تنقیدی نگاہ دوڑائیں گے، کن کن تنقیدی زاویوں سے اس کا جائزہ لیں گے............... پر اب ہم ان کے ان تنقیدی افکار سے بہرہ مند نہ ہو پائیں گے، ان سے اختلاف کا اظہار نہ کر پائیں گے، کوئی گرما گرم بحث نہ ہوگی، روٹھنے اور منانے کا لطف نہ ہوگا......ابدی جدائی کا بس یہی سب سے بڑا 'ڈرا بیک' ہے......انقلابی بس اسی لئے موت سے نفرت کرتے ہیں...............سوچنے اور پڑھنے، لکھنے والے عملی وفکری ساتھیوں کی جدائی کا بس اس سے زیادہ اور کوئی خلا نہیں ہوتا۔

عابد میر

'کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں!'

پوری دنیا میں میڈیا کے جو جدید رجحانات متعارف ہوئے ہیں، اس سے قارئین کے لئے فوری آگاہی کے سہل مواقع پیدا ہو چکے ہیں جبکہ میڈیا سے منسلک افراد کے لئے مصائب و پیچیدگیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ماضی میں جو ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے موٹے شیشے والی عینک سے دنیا کا قاری، تیز رفتار ترقی سے استفادہ کر کے 'ناظر' بھی ہو چکا ہے اور جو پل پل سے باخبر رہتا ہے، اس لئے ایسی ٹیبل اسٹوریوں پر جلتے چولہے سرد ہو گئے۔ اور نت نئے ٹی وی چینل اور اخباری اداروں کی کثرت نے میڈیا ورکرز کا ایک ایسا لشکر تیار کر لیا ہے جو خبر کے حصول کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔

جس طرح اس ملک کا وجود ایک حادثہ ہے بالکل اسی طرح یہاں سب کام بھی حادثاتی طور پر رونما ہوتے ہیں؛ یہاں تک کہ لوگ اپنا مستقبل بھی حادثوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اکثر بیروزگار ہوتے ہیں اور یوں جب شوقیہ طور پر وہ میڈیا سے تعلق جوڑتے ہیں تو نہ صرف انہیں شہرت ملتی ہے بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں ایک میڈیا ورکر کو غیر اعلانیہ مراعات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں ایک عام شہری کو زندہ رہنے کے لئے کیا چاہئے: یہی کہ دفاتر میں تھوڑی علیک سلیک ہو، پولیس خواہ مخواہ تنگ نہ کرے، واپڈا کا کنکشن فری ہو، فون والے بل نہ بھیجیں، ہسپتال والے خاص خیال رکھیں، قرض دینے والے سرکاری ادارے مالی مدد کریں اور یہ سب اگر ایک پریس کارڈ سے ممکن ہو جائے تو کیا قباحت ہے۔ اسی سوچ کے تحت اکثر بیروزگار نوجوان میڈیا سے منسلک ہو گئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی بھی اخبار یا چینل کے ادارہ کی جانب سے اپنے ورکر کی تقرری کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں۔ 'پہلے آیئے' کی بنیاد پر صحافت میں آنے والے نوجوانوں میں سے ملک کے کئی بڑے صحافی بن چکے

ہیں، مگر یہ بحث آج بھی موجود ہے کہ صحافت میں آمد کا کیا معیار ہونا چاہئے اور ایک حقیقی صحافی کون ہوتا ہے۔اس بحث میں حصہ لینے والوں کی ایک دلیل یہ ہے کہ تمام تنخواہ دار میڈیا ورکر صحافی کہلانے کے لائق ہیں جبکہ کچھ لوگ کالم نویسوں اور تجزیہ نگاروں کو صحافی نہیں مانتے جبکہ الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ افراد کے صحافی ہونے کے متعلق بھی کئی سوالات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اخباری اداروں یا ٹی وی چینلز سے تنخواہ پانے والے افراد کی تعداد انتہائی قلیل ہے جبکہ ان اداروں میں کام کرنے والے کارکن بہت زیادہ ہیں اور اداروں کے صدر دفاتر میں بیٹھے ہوئے لوگ جو کلرکی کا کام کرتے ہیں انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ جس خبر کی نوک پلک کر کے وہ ڈبل کالم اور سنگل کالم بنا دیتے ہیں، اس خبر کے حصول کے لئے ایک رپورٹر کو کس پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔دو برس قبل کا ذکر ہے کہ ضلع جعفر آباد کے ایک صحافی نے اپنے ادارے کو خبر بھیجی کہ شہر میں منشیات وفحاشی کے اڈے پولیس کی زیر سرپرستی کام کر رہے ہیں۔بس پھر کیا ہوا؛ پولیس نے اس صحافی کے لئے زمین تنگ کردی۔چوری کے جھوٹے مقدمے میں جبار عمرانی کو حوالات میں بند کر کے دو ماہ تک تشدد کے تمام نسخے آزمائے گئے۔ پولیس کی طاقت نے ایک نوجوان صحافی کو سماجی و مالی طور پر اس قدر کمزور کر دیا کہ آج وہ اپنے گاؤں حمید آباد میں گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔جس ادارہ کو اس صحافی نے خبر ارسال کی تھی ، وہ ادارہ نہ تو صحافی کو کوئی اجرت دیتا ہے اور نہ ہی کبھی یہ فکر کی کہ ایک اچھا بھلا رپورٹر کہاں اور کیوں کھو گیا۔ایک صحافی کی تذلیل ہوتے وقت اپنی صحافی برادری نے کوئی ساتھ دینے کی بجائے ان خبروں کی تردید اور پولیس کی کارکردگی کی تعریف کے بیانات اپنے اداروں کو بھیجے' نہ صرف یہ بلکہ ڈیرہ مراد کے ایک مشہور رہنما اور سابق صوبائی وزیر کے خلاف جب شہر کے صحافی سراپا احتجاج تھے تو کچھ اس کے بنگلے پر بیٹھ کر صحافیوں کے احتجاج کو غلط ثابت کر رہے تھے اور جب ہمیں جعفر آباد سے ہفت روزہ اخبار جاری کرنے کا موقع ملا تو وہاں کے سیاہ وسفید کے مالکوں نے کئی طرح سے رکاوٹیں ڈالیں۔'تعبیرِ بلوچستان' کے ایڈیٹر پر تین مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے جبکہ سرکاری وغیر سرکاری دھمکیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں اور تاحال مقامی عدالتوں میں دو مقدمات زیر سماعت ہیں جبکہ ایک مرتبہ تو اخبار کو بند کرنے کے لئے ضلعی اسمبلی سے قرارداد منظور کرانے کی کوشش بھی کی گئی۔اسی ہفت روزہ کے ایک چھوٹے سے دیہات کے نمائندہ نے جب ایرانی تیل سرعام فروخت کرنے کی خبر ارسال کی تو شائع ہونے کے بعد تیل کے تاجر رپورٹر کو دھمکانے اس کے گھر پہنچ گئے۔

اوستہ محمد میں پریس کلب پر قبضہ کیا گیا تو مقامی صحافیوں نے بااثر خاندان کے قریبی، بزرگ

صحافی کو اپنا صدر منتخب کر کے بڑی مشکل سے دوبارہ پلاٹ حاصل کیا۔ ان تمام حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بلوچستان کے صحافی جدید رجحانات کو کیوں قبول نہیں کرتے اور ان کا اپنے پیشہ سے وہ تعلق کیوں نہیں جڑ پاتا جس طرح ہمارے ہمسایہ صوبہ سندھ میں ہے، جہاں میڈیا اس وقت بلوچستان کی جنگ لڑ رہا ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟!

اس کا ایک پس منظر تو یہ ہے کہ سندھی صحافت میں دو دہائیوں سے ایسے افراد شامل ہو گئے ہیں جو ماضی میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، سوویت یونین کے زوال کے بعد ان تمام سیاسی کارکنوں نے صحافت میں پناہ لے کر سندھ کی صحافت کو ایک نیا موڑ اور تعارف دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے کردار سے اکثریتی عوام کی قسمت بدلنا چاہتے تھے اور انہوں نے اپنے قلم کی طاقت سے عوام کا تعلق صحافت سے جوڑ لیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اخباری مالکان غیر سندھی نہیں ہیں، اس لئے تمام اخبارات کی پالیسی عوام کی سوچ کے عین مطابق ہے جبکہ ہاں ہمارے صورتحال اس کے برعکس ہے۔ سیاسی طور پر تربیت یافتہ باشعور کارکنوں کا فقدان ہے، اس لئے نیم حکیم ہی قوم کے مسیحا بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے بلوچستان کے صحافی ادارے میں اپنی اہمیت اور معاشرے میں عزت کھو بیٹھتے ہیں اور صحافی یہ کھویا ہوا مقام پانے کی بجائے ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ کب کسی دوسرے صحافی سے کوتاہی ہو اور وہ اس کی ٹانگ کھینچ کر اس کی جگہ حاصل کر لے۔ صحافیوں کی اس کھینچا تانی کا فائدہ صحافی دشمن افراد، سیاسی شخصیات اور سرکاری افسران کو براہِ راست ہوتا ہے اور وہ صحافیوں کے ان اختلافات کو ہوا دیتے رہتے ہیں۔ یوں تو ایک صحافی کی دوسری صحافی کے خلاف [illegible]ی کے کئی واقعات ہیں، مگر ایک تازہ واقعہ یہ ہے کہ دو ماہ قبل جب سندھ کے شہر جیکب آباد میں بدامنی کی لہر اٹھی اور اچانک کمسن بچوں کا اغوا معمول ہو گیا تو وہاں کی سیاسی سماجی تنظیموں پر مشتمل شہری اتحاد نے پولیس کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز کر دیا۔ ہر روز احتجاجی مظاہرے ہونے لگے تو ایسے میں شہر کے ایک صحافی نے حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حسبِ عادت اپنے پاس جمع تمام سیاسی رہنماؤں کی تصوریں ایک سروے رپورٹ کے ہمراہ اپنے ادارہ کو ارسال کر دیں جس میں تمام رہنماؤں کی زبانی پولیس کی مذمت کی گئی تھی۔ واضح ہو کہ اس کام کے لئے کسی کو اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا اور تمام چھوٹے شہروں میں یہ ٹیبل اسٹوری کا رواج صحافیوں میں عام ہے۔ بہر حال اگلے روز پولیس کے خلاف خبر شائع ہوتے ہی ڈی پی او حرکت میں آ گئے اور جب سیاسی رہنماؤں سے رابطہ کر کے وضاحت طلب کی تو تمام رہنما سروے رپورٹ کی صداقت سے لاتعلق ہو گئے۔ پولیس نے مذکورہ صحافی اور پھر اس کے ادارہ سے رابطہ کیا اور اس صحافی سے

تمام دوستوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ ان تمام معاملات میں ان صحافیوں کے مخالف صحافی گروپ نے پولیس کی مشاورت کا کام کیا۔ جو سیاسی رہنما اپنا بیان اور اپنی تصویر شائع کرنے کے لئے صحافیوں کی منت سماجت کرتے ہیں، جب مشکل وقت آیا تو وہ پولیس کا ساتھ دینے لگے۔ اس کے بعد بھی مختلف حالات وواقعات پر ان رہنماؤں کے بیانات اخبارات کی زینت بن رہے ہیں اور صحافی کئی مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں' جبکہ ہونا یہی چاہئے تھا کہ صحافی ایک عرصہ کے لئے ایسے رہنماؤں کی خبروں کا بائیکاٹ کرتے مگر چونکہ یہ ایک گروپ کا مسئلہ بنایا گیا، اس لئے اگر چند صحافی بائیکاٹ بھی کرتے تو دیگر صحافی ان رہنماؤں کے بیانات ضرور چلاتے اور یہی وجہ ہے جس کا ایک صحافی یا صحافت کو نقصان ہے جبکہ مخالفین کو مکمل فائدہ ہے۔

ایک عام کارخانے میں مزدور اپنے حقوق کے لئے یونین بناتے ہیں۔ کارخانہ میں کام کرنے والے تمام محنت کش اس یونین کے رکن ہوتے ہیں اور انتخابات میں اپنی پسند کا امیدوار لانے کے لئے کئی پینل حصہ لیتے ہیں' پھر کامیاب ہونے والا پینل یونین آفس محنت کشوں کا مقررہ مدت تک نگران ہوتا ہے۔ اسی طرح افسران اپنے سرکاری کاموں سے فراغت کے بعد تفریح کے لئے جیم خانہ بناتے ہیں' جہاں دفتری کاموں سے ہٹ کر بات ہوتی ہے مگر واحد مخلوق صحافی ہے جو ایک جگہ پر جمع نہیں ہوسکتے۔ صحافیوں کو جمع کرنے کے لئے پریس کلب کا رواج تو عام ہوا مگر پورے ملک میں کہیں بھی ایک پریس کلب میں تمام صحافی جمع نہیں ہوسکے۔ کچھ عرصہ قبل ایک سندھی روزنامہ نے اپنے نمائندگان کو برتری کا احساس دیتے ہوئے پریس کلب سے الگ دفاتر قائم کرنے کی روایت ڈالی۔ بعدازاں نیشنل پریس کلب، سٹی پریس کلب اور دیگر ناموں سے صحافیوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلنے لگیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تمام شہروں میں پریس کلب کے قیام کے وقت جو افراد رکن ہوئے تھے، وہ اب صحافت سے برخاست ہونے کے باوجود پریس کلب پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ، پشاور سمیت تمام چھوٹے شہروں میں بھی پریس کلب کی نئی رکنیت پر پابندی عائد ہے بلکہ جیکب آباد پریس کلب میں تو 'غیر ممبر صحافیوں کی داخلہ پر پابندی' کے توہین آمیز نوٹس بھی چسپاں ہیں اور کئی بار نام نہاد سینئر صحافیوں نے ذلت آمیز رویہ اختیار کرتے ہوئے غیر ممبر صحافیوں کو پریس کلب سے نکال بھی دیا ہے۔ اس سے زیادہ حیران کن اور افسوسناک بات یہ ہے کہ غیر ممبر اراکین میں وہ تمام صحافی شامل ہیں جو دورِ حاضر کے مصروف و معروف پریس ورکر ہیں جبکہ اندر بیٹھے ہوئے ممبران میں سے اکثر صحافت سے ریٹائر ہوچکے ہیں، نہ صرف یہ بلکہ ان ریٹائر ''صحافیوں'' کے لئے

سرکاری اداروں سے وظائف بھی مقرر ہیں اور انصاف کی جدوجہد تو یہ ہے کہ پریس کلب کے کسی رکن سے کہیں ناجائزی ہو تو آسمان سر پر اٹھا دیتے ہیں اور بلاتفریق تمام صحافیوں کو جمع کر کے نہ صرف اخبارات میں کوریج لیتے ہیں بلکہ احتجاج کر کے اپنا مسئلہ بھی حل کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی غیر ممبر صحافی سے کوئی مسئلہ درپیش ہو تو پھر قانون، آئین، قاعدے وضابطے یاد آتے ہیں۔ اسی طرح جیکب آباد کے ایک صحافی نے جب بار کونسل کے صدر اور ایک یوسی کے نائب ناظم کا انٹرویو شائع کیا جس میں تحصیل ناظم پر سخت تنقید تھی تو بااثر سیاسی خاندان کے ''امریکہ پلٹ'' تحصیل ناظم برہم ہو گئے مگر جب اسی صحافی نے تحصیل ناظم کا جوابی انٹرویو شائع کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور صحافی کو مالی امداد کی پیشکش بھی کی۔ بڑی بدنصیبی اس صحافی کے کہ اگلے چندروز میں تحصیل ناظم کے بااثر خاندان سے ہی وابستہ ایک قریبی شخصیت نے اپنے ہی خاندان کے خلاف زبردست سیاسی تنقید کی جو اخبار میں من وعن شائع ہوئی، پھر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تحصیل ناظم اس قدر سیخ پائے ہوئے کہ دفتر سے اٹھے اور اپنے قریبی افسران وماتحت کے دفاتر میں آنیوالے دو خاص اخباروں کے نام لے کر ان پر پابندی عائد کی۔ اخبارات بغل میں لے کر پہنچنے والے صحافیوں نے تحصیل ناظم کو یہ خبریں مفہوم سمیت پڑھ کر سنائیں، اس پر بھی ان کے دلوں میں ٹھنڈ نہیں پڑی۔ پھر تحصیل ناظم نے اس ایک صحافی کی نہ صرف مالی امداد کی درخواست رَد کی بلکہ اخبارات واشتہارات کے آڈٹ کئے ہوئے بل بھی روک دیے۔ متاثرہ صحافی کے استفسار پر تحصیل ناظم نے صحافی کو توہین آمیز جملے کہہ کر آفس سے نکال دیا۔ مذکورہ صحافی نے پریس کلب، نیشنل پریس کلب سمیت تمام صحافیوں سے درخواست کی کہ مسئلہ پر آواز اٹھائی جائے مگر وظیفہ بند ہونے کے خوف سے صحافی مسلسل ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔

علاقہ میں بااثر سیاسی شخصیات کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ایک صحافی کسی جاگیردار کا خاص آدمی ہونے کے تعارف کو باعث فخر سمجھتا ہے۔ آج صحافی مطالعہ سے دور بھاگتا ہے۔ اس لئے مختلف سیاسی وسماجی مسائل پر اس کی شعوری سطح معیاری نہیں ہوتی اور وہ بہت جلد طاقتور سیاسی لوگوں کے پھیلائے ہوئے خوف کو قبول کر لیتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ڈیرہ اللہ یار میں تھانہ کے ایس ایچ او کے خلاف جب سندھ کے اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں تو پریس کلب کے ایک گروپ کے صدر پولیس کے نمائندہ بن کر صحافیوں کو سمجھانے آئے اور جب صحافی نہ مانے تو اس نے ساتھ نہ دینے کی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ 'میں کمزور ہوں، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میرے گھر کا راشن پانی بند ہو جائے گا'۔ بلوچستان میں آج بھی تمام خبریں بااثر لوگوں کی سینسر شپ کے بعد ارسال کی جاتی ہیں۔ اسی لئے تو جعفرآباد کے

باا ثر سیاسی خاندان کے ایک فرد کی موت کو قتل کے بجائے خودکشی لکھا گیا اور گڑھی خیرو کے باا ثر سیاسی خاندان میں سیاہ کاری کا واقعہ ہوا تو مقامی صحافیوں کو سانپ سونگھ گیا۔ایک ہفتے بعد جیکب آباد کے صحافیوں نے یہ خبر شائع کی۔

آج ہر صحافی اور بالخصوص بلوچستان میں صحافت کرنے والے افراد کو سوچنا ہوگا کہ ہم معاشرے میں ایک بہتر مقام حاصل کیوں نہیں کر سکے!اس کی اصل وجہ خود صحافی کا کمزور کردار ہے۔صحافت پوری دنیا میں اکثریتی لوگوں کے لئے ہوتی ہے، جسے عوام کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں عوام کی حالت ابتر ہے۔اس کے باوجود اگر صحافی چند اشخاص کی خوشنودی کے لئے ''سب ٹھیک ہے'' لکھتا رہے گا تو عوام میں عزت کیونکہ پائے گا۔ہمارے ہاں صحافت کو ہمیشہ پارٹ ٹائم جاب سمجھا جاتا رہا ہے۔اکثر سرکاری ملازم صحافت کرتے رہے ہیں مگر تیز رفتار ترقی میں اب صحافت فل ٹائم جاب ہے اور صحافت میں شمولیت کے بعد کسی کام کے لئے سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔مگر صحافی بھی اس معاشرے کا انسان ہے' جس کا گھر ہے ماں، باپ، بہن، بھائی، بیوی بچے سب رشتے ہیں۔آخران سب کا گزر سفر کیسے ہوگا؟ کیا محض شوق کی خاطر ایک انسان پورے خاندان کو فاقوں میں مبتلا کرسکتا ہے؟ اس کے لئے اخباروں اداروں کو پابند کرنا ہوگا تا کہ وہ اپنے ورکرز کی اجرت مقرر کریں۔مگر اس سے قبل اپنے آپ میں یہ خودداری پیدا کرنی ہوگی کہ اپنے شوق میں اداروں کی فرمائش پوری کرنے کے لئے پورے گھر کو بھوکا نہیں رکھیں گے۔یہاں تو ایک صحافی اگر کسی ادارہ میں کرنے سے جواب دے تو مفت میں کام کرنے والوں کی پیچھے ایک قطار ہوتی ہے۔اس سیلاب کو روکنا ہوگا۔

بلوچستان میں فیڈرل یونین آف جرنلسٹ، بلوچستان یونین آف جرنلسٹ، کوئٹہ یونین آف جرنلسٹ سمیت کئی صحافتی تنظیمیں کام کررہی ہیں مگر کبھی کسی نے نہیں سوچا کہ کوئٹہ کے علاوہ دیگر شہروں میں پریس کلب کا قیام عمل میں کیوں نہیں آسکا ہے۔کچھ شہروں میں صحافی اپنی مدد آپ کے تحت کرائے کے دکانوں میں پریس کلب قائم کئے بیٹھے ہیں مگر حکومت کی جانب سے کوئی سرپرستی نہیں۔حالانکہ گورنر اویس غنی نے صحافیوں کے کنونشن میں اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے ہی تجویز کردہ نقشہ پر تمام اضلاع میں پریس کلب تعمیر کروائیں گے۔مگر اندرونِ بلوچستان صحافتی گروہ بندیوں سے گھبرا کر شاید گورنر بھی خاموش ہوگئے ۔اب صحافیوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ تمام علاقوں میں پریس کلب کی سرکاری عمارت ان کی اولین ترجیح ہونی چاہئے۔باقی گروپ بندیاں اور جھگڑے چاردیواری کے اندر بیٹھ کر طے کئے جاسکتے ہیں۔نیز یہ تلخ

حقیقت بھی قبول کرنا ہوگی کہ پریس کلب کے قیام میں مقامی بااثر سیاسی شخصیات ہی بڑی رکاوٹ ہیں' ورنہ اگر یہ افراد چاہتے تو آج سابق وزیراعظم کے آبائی ضلع میں پریس کلب کی شاندار عمارت ہوتی اور تمام صحافی ایک صحافی کالونی میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ڈیرہ مراد میں پ پ کے سابق صوبائی وزیر بھی صحافیوں کی مدد کر سکتے تھے مگر جب مقامی صحافیوں نے ہی ایک دیہاڑی پر اکتفا کیا تو دینے والے مکمل راشن کا کیوں سوچیں؟

اس حقیقت کو قبول کرنا ہوگا کہ پریس کلب صحافیوں کے محفوظ شیلٹر ہیں،پناہ گاہ ہیں اور جدید صحافت میں صحافیوں کو پناہ گاہ کی اشد ضرورت ہے۔اس عمارت پر کسی مخصوص گروہ شخص کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے اور فیلڈ میں رہنے والے تمام صحافیوں کے لئے پریس کلب کے دروازے کھلے ہوئے چاہئیں۔ حکومت کی جانب سے تمام پریس کلب کو میڈیا کی جدید سہولتوں سے آراستہ کرنا چاہئے۔سیاسی سماجی تنظیموں کو مشکل وقت میں صحافیوں کو تنہا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اگر صحافی اپنے وجود کی بقا کے لئے سڑکوں پر آئیں گے تو سیاسی تنظیموں کی جنگ ادھوری رہ جائے گی۔میڈیا سے منسلک کیمرہ مین،فوٹو گرافر،کالم نویس،کمپیوٹر آپریٹر صحافت کے بنیادی اجزا ہیں،اس لئے صحافیوں کو ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی بجائے اپنی تعداد میں اضافہ کرنا چاہئے اور متحد رہنا چاہئے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ صحافت ریاست کا چوتھا ستون ہے اور اگر ستون کمزور پڑ جائے تو پوری عمارت میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔نیز حکومت کو بھی صحافت سے روایتی تعلق اور لاپرواہی برتنے کے بجائے اس پر مکمل توجہ دینی چاہئے تاکہ عوام اور ریاست کے درمیان ایک صحافی آگاہی ونمائندگی کا درست رابطہ کار ہو سکے۔اخباری اداروں ٹی وی چینلز ودیگر میڈیا مالکان کو بھی اپنے ورکرز کی تربیت کا معقول انتظام کرنا چاہئے کیونکہ مفت میں کام کرنے والے ایک صحافی کی خبر سے ہی وہ کروڑوں کا منافع کماتے ہیں۔اس منافع سے ''انعام'' نہ سہی مگر ایک صحافی کو جان کی امان دینا تو ادارہ کے فرائض میں شامل ہونا چاہئے۔

(7دسمبر،2006ء)

''آؤ! اپنوں کے پاس چلیں''

جب ہم جوانی میں بھرپور تھے تو ایک بھارتی گلوکار کی غزل شوق سے سنتے تھے؛

کسی نے بھی تو نہ دیکھا نگاہ بھر کے مجھے

گیا پھر آج کا دن بھی اداس کر کے مجھے

یہ کہانی تو کسی اداس عاشق کی ہوگی کہ ایک اور 'بے کار' دن گزر جانے پر وہ مایوس ہے مگر ہمارے بلوچستان میں تو ایک دن نہیں' ایک سال نہیں بلکہ کئی گزرتے سالوں کا ذکر ہے کہ کسی نے بھی اس طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا ہے۔ جب سے ہم نے اپنی آزادیاں اس ملک کے محدود دائروں میں قید کی ہیں اور اپنی خوشیاں ''بڑے بھائیوں'' کی خوشحالی سے منسوب کی ہیں، تب سے سونا اگلنے والی سرزمین کے وارث ہونے کے باوجود محرومیوں کے اندھیروں میں ڈوبتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی نئے سال کی آمد کی نوید بھی ہمیں سناتا ہے تو ہم یہ شمار کرنے لگتے ہیں کہ چار بھائیوں کے اس گھر میں برابری کا درجہ ہم اس برس بھی حاصل نہیں کر سکے۔

یہ بات تو بہت پرانی ہے مگر ہے بڑے کام کی کہ ہر سال اپنی سالگرہ منانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک سال کم ہوا ہے اور یہ خوشی کا نہیں افسوس کا مقام ہوتا ہے بلکہ اسی طرح ہم جب نئے سال کی آمد کا جشن مناتے ہیں تو تیزی سے گزرتے ہوئے سال کو بھول کر دراصل ہم اپنی ناکامیوں و محرومیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات جب ایک فرد کی ہو تو وہ اپنی ذات کو جھوٹی تسلی دے سکتا ہے مگر جب ذکر قوموں کا ہو تو گزرے لمحات کو فراموش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جب قوموں کی تاریخ بھی ماضی سے استفادہ حاصل کرے تو ہم بھلا کیسے آنکھیں چرا سکتے ہیں اور جب ہم گزرے سال سے آنکھیں چار کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے سال میں ایک بھی لمحہ ایسا نہیں

گزرا جب اس ملک کی آزادی نے اپنے تنگ دائروں میں ہمارے لئے احترام کا جذبہ پیدا کیا ہو۔ ہم تو ہر سال ریوڑ کی طرح ہوتے ہیں، بس ہمارے ہانکنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ ہم کبھی اسلام سے تو کبھی اسلام آباد سے' کبھی بڑے بھائیوں سے تو کبھی اس ملک سے اپنی سچائی ثابت کرنے کیلئے اقرار کی گردن ہلاتے رہتے ہیں۔

جس طرح گزرے ہوئے سال اور نئے سال کے مہینوں اور دنوں کے نام میں کوئی فرق نہیں بالکل اسی طرح ہم بلوچوں کے حالات میں بھی 1948ء سے 2006ء تک کوئی تبدیلی نہیں۔ ہم جب خود مختار تھے اور اپنے وسائل پر ہمارا ہی حق تھا، تب ہم زیادہ خوشحال تھے۔ اپنی سرزمین کی حفاظت اپنی جان پر کھیل کر کرتے تھے۔ کوئی حملہ آور فاتح نہ ہو پاتا تھا۔ مگر جب ہم نے اپنی حفاظت کیلئے 'چوکیدار' مقرر کیے تو رات کی تاریکی میں انہوں نے اپنے ہتھیار ہم پر ہی تان لئے۔ اس سرزمین کے اصل وارثوں کو قتل کر کے وسائل کو لوٹنے کا سلسلہ تو بہت پرانا ہے اور یہ تسلسل تاحال جاری ہے۔ اسلام آباد پر حکومت وردی کی ہو یا شیروانی کی' بلوچوں کی بے باکی کسی کو پسند نہیں۔ اس لئے تمام تر طاقتوں کے ساتھ وہ بلوچوں پر ہر سال اپنے اسلحہ کا تجربہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے رہنما کھونے کا تجربہ بھی ہمارے لئے نیا نہیں۔ ہم ہر سال اپنی سرزمین کا کوئی مضبوط وارث کھو بیٹھتے ہیں اور آئندہ سال کیلئے پھر کوئی نیا وارث تیار کرتے ہیں۔ مگر یہ سلسلہ آخر کب تک چلتا رہے گا؟ اب یہاں ''بازو بھی بہت' سر بھی بہت'' والی بات بھی نہیں۔ اب تو ہمارے گھروں میں آ کر ہمیں ڈرایا دھمکایا جاتا ہے اور ہمیں سبق سکھانے کی باتیں کی جاتی ہیں۔

تو کیا ہر سال ہم یونہی محرومیوں کا رونا روتے رہیں گے اور نئے سال میں پھر کسی قربانی کیلئے تیار رہیں گے۔ گزرنے والے سال میں کیا نیا تھا اور نئے سال میں کیا ہو گا' اب یہ سوچنے کا وقت ہے۔ اب ہمارے پاس کھونے کیلئے اور کیا ہے۔ کسی رہنما کو قتل کیا جاتا ہے تو کوئی نظر بند کیا جاتا ہے، سیکڑوں کارکن غائب کر دیے جاتے ہیں اور پھر بھی ہماری سچائی مشکوک ہوتی ہے۔ سچائی کا یہ امتحان آخر یکطرفہ کیوں ہے۔ ہم اپنے وسائل پر سرزمین پر شراکت داری کرتے رہیں، اپنے تعلیمی ادارے ویران کرتے رہیں، فوجی چھاؤنیوں کیلئے راہ ہموار کرتے رہیں، بس یہی امتحان ہے اپنائیت ظاہر کرنے کا' وہ ملک اور وفاداری کے نام پر ہمیں کچلتے رہیں اور ہم برداشت کرتے رہیں۔ تین دنوں کے مہمان گھر کے مالکوں کو کھری کھری سنائیں اور ہم سنتے جائیں۔ بس آئندہ سال بھی یہی ہو گا اور ہمارے وسائل ہم سے چھین کر، ہمیں محرومیاں دے کر پھر کوئی، ہمیں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ نیا سال گزشتہ برسوں سے مختلف ہو تو ہمیں تبدیل ہونا ہوگا۔ اپنے وسائل اور سرزمین پر حقِ حاکمیت کیلئے انفرادی دائروں سے نکل کر، قبائلی پہچان کو قربان کرکے قومی تشخص کیلئے ایک ہونا ہوگا۔ اگر ایسا ہم نے کرلیا تو آئندہ سال کا سورج اپنی کرنوں سے ہمیں تبدیلی کی نوید دے گا۔ آئیں اس چمکتی تبدیلی کیلئے اپنوں کو تیار کریں، اپنوں کے پاس جائیں۔

(11 جنوری، 2007ء)

بلوچ دشمن سے ترقی دشمن کہلانا بہتر ہے

جب اس ملک کی آزادی کا اعلان ہوا تھا تو سندھ کا شہر کراچی دارالحکومت قرار پایا تھا مگر پھر مذہب کے نام پر جب بھارت اور بنگال سے آئے ہوئے لوگوں کو کراچی میں رہائش دی گئی تو صاحبانِ اقتدار کو ان کے قریب اور ساتھ رہنا ناگوار گزرا، یوں کراچی سے بہت دُور ''اسلام'' کو ''آباد'' کیا گیا۔ جس کے بعد پورا کراچی بھارتی مہاجرین اور بنگالیوں کے حوالے ہوگیا اور سادہ مزاج، امن پسند سندھی اپنے وطن میں اجنبی ہو گئے۔ ایک عرصہ تک کراچی عالمی منڈی پر چھایا رہا اور غیر مقامی لوگ جھونپڑیوں سے نکل کر محلات بناتے رہے۔ پھر جب کراچی کے امن کو نظر لگی تو عالمی سرمایہ کاروں کو ایک نئے ساحل کی تلاش تھی اور دنیا کی طاقتوں کو دیگر ممالک میں اپنا خوف پھیلانے کیلئے ایک ساحلی گیٹ وے کی ضرورت تھی۔ بس پھر سب کی نظریں گوادر پر ٹک گئیں اور سب کیلئے گوادر مرکز بن گیا۔ تمام سرمایہ کاروں' تاجروں' لینڈ مافیاؤں نے گوادر کا رخ کر لیا اور ہمارے حکمران راتوں رات گوادر کو جنت بنانے کے منصوبے تیار کرنے لگے۔ سب کام ایک ہی وقت شروع ہوئے۔ لوگ سمجھنے لگے کہ گوادر والوں کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔ مگر ایک بار پھر کراچی کا تجربہ دہرایا گیا۔ غیر مقامی لوگ آباد کئے گئے اور گوادر کے اصل وارث بے دخل ہونے لگے۔ جس پر تمام بلوچ پرستوں نے چیخنا چلانا شروع کیا کہ جس ترقی میں سرزمین کے مالک شامل نہ ہوں، وہ ترقی ہمیں قبول نہیں۔ ان باتوں پر حکومت نے بلوچوں کو ترقی دشمن قرار دیا گیا۔ طاقت کے زور پر گوادر میں ترقی کا عمل شروع ہوا۔

گوادر اور عمان میں ظاہری طور پر ذرا بھی فرق نہیں۔ سلطنت آف عمان کا دارالحکومت مسقط سٹی وادی کبیر میں مشہور رومی بازار کے لوگ آج بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ پورا علاقہ پاکستان کا تھا۔ دراصل آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مشیر وی پی مینن نے جب برصغیر کی تقسیم کا نقشہ تیار کیا تھا تو ڈھاکہ بھی

اس نقشے میں پاکستان میں شامل تھا مگر ڈھاکہ جانے کیلئے پاکستان سے خشکی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس طرح رومی بازار کو پاکستان اور گوادر کو عمان کے حوالے کیا گیا تو رومی بازار پہنچنے کیلئے بھی کوئی خشکی کا راستہ نہیں تھا۔ عمان کے سربراہ سلطان قابوس جب اپنے باپ کی لاش سے گزر کر تخت پر بیٹھے اور کرنسی پر اپنی تصویر دینے کا شوق پورا کیا تو اس دوران حکومتِ پاکستان نے عمان کو رومی بازار دے کر بدلے میں گوادر کا علاقہ واپس لے لیا۔ بلوچ نژاد حکمران سلطان قابوس کے عمان کی فوج میں آج بھی گوادر کے بلوچوں کی اکثریت ہے۔ گوادر سے براستہ سمندر عمان پہنچنے میں چند گھنٹے خرچ ہوتے ہیں۔ اس قربت کی وجہ سے کہتے ہیں کہ عمان و گوادر کے باشندوں کی شکل وصورت اور جسمانی حالت میں بھی کوئی خاص فرق نہیں۔ اگر گوادر سے سڑک کے راستے جیونی کلاتو سے ذرا آگے چلا جائے تو ایران کی سرحد کا پہلا شہر نوبندیان ہمارا استقبال کرتا نظر آئے گا۔ نوبندیان سے نصف گھنٹے کی مسافت پر چابہار نامی ایک شہر ہے، جہاں ایران وانڈیا کے اشتراک سے بندر آزاد کے نام سے مکمل فری پورٹ بنائی گئی ہے، جس کے بدلے ایران نے بھارت کو گیس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ گیس پائپ لائن پاکستان سے گزرنی ہے جس کے سامنے امریکہ بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ ایک معاہدہ کے تحت گوادر سنگاپور کے حوالے ہو چکا ہے اور 23 مارچ 2007ء کو بندرگاہ کا افتتاح ہونا ہے۔ اس وقت گوادر شہر میں قدم قدم پر مستقبل کیلئے سونے کی کان کے سائن بورڈز نصب کئے گئے ہیں۔ گوادر سے چابہار براڈ گیج ریلوے لائن کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ گوادر سے کھوکھراپار سڑک کا کام بھی جاری ہے۔ گوادر سے کراچی کوسٹل ہائی وے کی وجہ سے اورماڑہ نامی شہر کی ترقی بھی ہوگی۔ گوادر سے جیونی 50 کلومیٹر کا فاصلہ ہے، جہاں کیلئے علم میں آیا ہے کہ یہ پورا علاقہ فروخت ہو چکا ہے اور تمام خریدار 'بڑے بھائی' ہیں۔ اس لئے بلوچوں کے خدشات ہیں کہ وہ اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے اور اس امکانی آباد کاری میں رکاوٹ بننے کیلئے وہ مزاحمت بھی کر رہے ہیں۔ بلوچ قوم پرست رہنما سردار عطا اللہ مینگل تو کئی بار دیگر خوف ظاہر کرنے کے علاوہ یہ نشاندہی بھی کر چکے ہیں کہ گوادر تا کراچی کوسٹل ہائی وے پر قائم تمام چیک پوسٹوں پر غیر بلوچ اہلکار تعینات ہیں۔

کچھ عرصہ قبل میڈیا میں امریکہ کے جاری کردہ اس نقشے کا بہت چرچا ہوا تھا جس میں بلوچستان کو پاکستان سے الگ ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ سب خام خیالی نہیں بلکہ ایک منصوبے کے تحت انتہائی چالاکی و خاموشی سے کام ہو رہا ہے۔ سیاسی تجزیہ نگار تو یہاں تک کہتے ہیں کہ روس کی افغانستان میں مداخلت، پھر روس کا زوال اور افغانستان میں امریکی قبضے کا بنیادی سبب بھی گوادر ہی ہے۔ یہ بھی ایک کڑی حقیقت ہے

کہ گوادر پر دنیا کی نظریں بڑے عرصے سے پیوست ہیں۔ جب ہانگ کانگ، برطانیہ کی قید سے آزاد ہو کر واپس چین کو ملا تو عالمی قوتوں کو ایشیا میں گیٹ وے کیلئے گوادر کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ایسے میں صوبہ سرحد کو افغانستان کے حوالے کرنا اور پنجاب و بلوچستان کو ملا کر ایک آزاد وطن بنانے کے بیانات بھی کسی مخفی معنی سے خالی نہیں۔ اس وقت جب صوبہ سرحد و صوبہ سندھ کے باشندے پنجاب سے اپنی بیزاری ظاہر کر چکے ہیں تو پنجاب کے سرمایہ کاروں کی دلچسپی بلوچستان میں بڑھی ہے۔ گوادر بندرگاہ عالمی طور پر چین و امریکہ کی دلچسپی ولڑائی کا مرکز بھی ہے۔ گوادر کیلئے ایک ماحول تیار ہو چکا ہے۔ چین دنیا کی مارکیٹ میں مکمل حاوی ہے، یہاں تک کہ چین امریکہ میں صرف اپنے تیار کردہ جوتے بھیج کر امریکی جوتوں کی مارکیٹ خراب کر دیتا ہے۔ الیکٹرانکس کی چیزوں میں بھی وہ سب کو مات دے دیتا ہے جبکہ امریکہ اسلحہ کی دوڑ میں سب سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ لوہے کے ایک پاؤ کی قیمت دس روپے ہوتی ہے' ہم دس روپے کے اس ٹکڑے کو اسلحہ میں تبدیل کر کے لاکھوں میں فروخت کریں گے۔ گوادر بندرگاہ کیلئے چین کی اپنی ترجیحات ہیں، مگر امریکہ کو وہاں مستقبل میں سونے کی کان کی بجائے اسلحہ کی کان نظر آ رہی ہے۔

گوادر پر جنگ چین و امریکہ کے مابین ہے اور حکومت یہ بندرگاہ سنگاپور کے حوالے کرنے کے اعلانات کر رہی ہے۔ مگر اس پوری داستان میں کہیں بھی بلوچوں کا ذکر نہیں، جو اس زمین کے اصل وارث ہیں۔ گوادر کے باشندے اپنے گھر میں ترقی چاہتے ہیں یا نہیں، اس بات کا فیصلہ 'بڑے بھائی' کرنے لگے ہیں۔ اس موقع پر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر عمارات و سڑکوں کی تعمیر ہی ترقی ہے تو پھر گوادر واقعی عالمی شہر بن جائے گا مگر گوادر کے اصل باشندے وہاں کے گھروں میں نہیں رہ پائیں گے، وہاں کے کارخانوں میں روزگار حاصل نہیں کر پائیں گے، سڑکوں پر سفر نہیں کر پائیں گے، سکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کر پائیں گے، تو پھر آخر اس ترقی میں کس کا فائدہ ہوگا؟ کس کی قسمت بدلے گی؟ اگر گوادر کے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے دربان بلوچوں کے داخلہ کو ممنوعہ قرار دیں گے تو پھر بلوچ پرست رہنما ترقی سے انکار ٹھیک ہی تو کرتے ہیں کیونکہ بلوچ دشمن کہلانے سے ترقی دشمن کہلانا کہیں بہتر ہے۔

(15 جنوری، 2007ء)

'اے کاش تم یہ جانتے آزاد فضا کیا ہوتی ہے!'

بلوچستان کے قریبی صوبہ سندھ میں صوفی بزرگ شاہ عبداللطیف بھٹائی کو قومی شاعر کا درجہ حاصل ہے، جنہوں نے اپنے کلام میں سیاسی وسماجی حالات کو اس طرح بیان کیا کہ پڑھنے والوں کو ہر بار ایک نیا ولولہ ملتا ہے۔ شاہ لطیف نے اپنے کلام میں وطن کو محبوب سے تشبیہ دیتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے کہ ''سردی ہو یا گرمی تم چلتے ہی چلو یہ بیٹھنے کا وقت نہیں ایسا نہ ہو کہ اندھیرا ہو جائے اور تم محبوب کے نشان کھو بیٹھو۔'' ایسی جذباتی، رومانوی اور وطن پرستی سے بھرپور شاعری نے سندھ میں کئی شخصیات کو جنم دیا مگر ہم یہاں صرف تین اشخاص کا ذکر اس لئے کریں گے کہ وہ گزشتہ ہفتے میں کسی نہ کسی طرح میڈیا میں رہے اور تینوں کا ایک مشترک تعلق یہ ہے کہ وہ تینوں اپنے وطن اور وطن والوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ان میں پہلا ذکر شیخ ایاز کا کرتے ہیں، جنہیں سندھی شاعری کا 'لطیف ثانی' کہا جاتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف شاہ لطیف کے سندھی کلام کا اردو ترجمہ کیا بلکہ خود بھی اردو میں شاعری کی۔ سندھی میں شیخ ایاز کی شاعری نے خاص طور پر ون یونٹ تحریک میں جلتی پر تیل کا کام دیا اور وہ کئی بار پابندِ سلاسل بھی رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے لکھا کہ؛ ''سچ بڑا مجرم ہے، روزِ ازل سے پکڑا گیا ہے، زنجیروں میں جکڑا گیا ہے، کبھی تیل کڑھائی ڈالا گیا، کبھی بلندی سے دھکیلا گیا، کبھی پھانسی پر لٹکایا گیا، ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارا گیا، آج تیرا مہمان ہوا ہے، تم نے کبھی سوچا ہے، یہ کس سے تیرا ناطہ ہے!'' ایم آر ڈی تحریک میں بیدل مسرور کے وائسز گروپ نے جب اس گیت کو اپنی آواز دی تو جیسے سچ صحراؤں میں مور کی طرح ناچنے لگا۔ شیخ ایاز نے ایک اور جگہ کہا ہے کہ؛ ''اے کاش! تم یہ جانتے آزاد فضا کیا ہوتی ہے!'' آزادی کے نام پر اپنے وطن میں دم گھٹتی سانسوں کا شیخ ایاز کو شدید احساس تھا، اس لئے انہوں نے اپنے کلام میں انگارے بھرتے ہوئے لکھا کہ ''جس نے آزاد پل گزارے ہیں، اس کیلئے موت کوئی چیز نہیں، قدم قدم پر جال دیکھ کر کیا شیر نے اپنی

دھاڑ چھوڑی ہے کبھی، کسی بھی عقاب سے ڈپٹ کر گھونسلے میں چھپا ہے کبھی، خوف تو گیدڑ پالتا ہے، چڑیا ڈر میں پھڑکتی ہے، جس نے آزاد گزارا ہے اس کیلئے موت کوئی چیز نہیں، غلامی کی پوری زندگی سے آزادی کا ایک پل اچھا ہے، اور تم نے اپنی پوری حیات جس پل میں بھرپور بھری ہے، اس پل کی طاقت صدیوں پر بھاری ہے، اس کی عمر سب سے بڑی ہے، جس نے آزاد گزارا ہے اس کیلئے موت کوئی چیز نہیں۔'' اس آزادی پسند انقلابی شاعر شیخ ایاز کی برسی پورے سندھ میں منائی گئی اور سندھی ادب میں ان کی تخلیقات پر وسیع پیمانے پر جدید طرز پر تنقیدی، تحقیقی و تعمیری کام ہو رہا ہے۔

دوسری شخصیت لالا شاہ محمد درانی ہیں جو گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ وہ سندھ کے شہر خیر پور کے رہائشی تھے اور کسان تحریک کا ایک معتبر نام تھے۔ بلوچستان میں بزگر کمیٹی کے عروج سے لے کر جہاں جہاں بھی کسانوں کے نام پر کوئی تحریک چلی ہے، وہاں ہر ایک چاچا درانی کے نام سے ضرور واقف ہوگا۔ بلوچستان کے پٹ فیڈر میں کسانوں کی تحریک ہو یا کوئی جلسہ جلوس ہو، چاچا درانی ضرور پہنچتے تھے۔ طنز و مزاح سے بھرپور ان کا خطاب تو جیسے جلسے میں رنگ بھر دیتا تھا۔ کسانوں کے حقوق کی خاطر وہ سندھ اور بلوچستان کی مختلف جیلوں میں بھی قید رہے۔ اپنی آخری سانسوں تک اس ایمان پر قائم رہے کہ ''زمین کا سینہ چیر کر دن رات جو محنت کرتا ہے زمین کا اصل مالک بھی وہی ہے۔'' ان کی وفات سے ملک بھر کے کسان اپنی ایک مضبوط آواز سے محروم ہوئے ہیں۔

ہمارے تذکرے کی تیسری شخصیت انور پیرزادہ ہیں جو ابھی حال ہی میں کراچی میں وفات پا چکے ہیں۔ ان کا آبائی گاؤں سندھ کے قدیمی آثار کے مرکز موہن جودڑو کے قریب ہے۔ بائیں بازو کی سیاست کے زمانہ عروج میں ان کے گاؤں کو لٹل ماسکو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ گو کہ ان کی وجہِ شہرت شاعری تھی مگر بنیادی طور پر وہ صحافی تھے اور سندھ کی جدید صحافت میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ وہ شاہ لطیف کی شاعری کے محقق بھی تھے مگر اس سے زیادہ وہ اچھے سیاح بھی تھے۔ انہوں نے صرف اپنی تجزیاتی رپورٹ کیلئے دریائے سندھ کا سفر اس کے آغاز سے انتہا تک کشتی میں سوار ہو کر کیا۔ سندھ کی دیہی زندگی، سماجی مسائل و محرومیوں کا اخبارات میں نئے انداز سے ذکر کر کے انہوں نے سندھ کی صحافت کو نیا موڑ دیا۔

ان تینوں شخصیات کی جسمانی جدائی ہو چکی ہے، مگر اپنے نظریات و اپنے کام میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جس طرح سندھ کے لوگ سندھ کی آئندہ نسل ان کے نظریات سے استفادہ حاصل کرے گی، اسی طرح بلوچستان کی آئندہ نسل بھی ان تینوں یا ان کے علاوہ دیگر عظیم شخصیات کے کام، نظریات کو پڑھنے

اور سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنی زندگی' اپنے وطن اور وطن والوں کیلئے وقف کر دے۔ ہمارے حالات کا تقاضا ہے کہ جب تک ہم اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال صرف اپنے وطن کیلئے جنون کی حد تک نہیں کریں گے تب تک منزل ہم سے دور رہے گی، جس کے خواب ہم سب ایک عرصہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس وطن کی بہت ساری زندگیوں میں آزادی لانے کیلئے ہمیں پہلا قدم اٹھانا ہی ہوگا جس کے بعد قافلہ بنتا جائے گا اور بڑھتا جائے گا۔

(16 جنوری، 2007ء)

برابری کے لہجے میں برادرانہ بات کی جائے

بلوچستان کی ترقی کی بات حکومت بھی کررہی ہے تو یہاں کے قوم پرست بھی ترقی کے داعی ہیں پھر اختلاف کہاں ہے؟ آخر اصل ترقی کون چاہتا ہے؟ قوم پرست کہتے ہیں کہ ترقی کے خواہش مند تو ہم بھی ہیں مگر حکومت کے طریقہ کار پر انہیں تحفظات ہیں۔ ان کے اس اختلاف کو حکومت ترقی کی راہ میں رکاوٹ سے تشبیہ دے رہی ہے جبکہ عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو وفاقی حکومت، بلوچستان میں عالمی مفادات کا تحفظ کررہی ہے اور اس عمل میں بلوچستان کے اصل باشندوں کو باہر رکھا جارہا ہے۔ جس کی وجہ سے بلوچ عوام میں یہ خدشات پیدا ہوئے ہیں کہ انہیں اقلیت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔

بلوچ عوام حکومتی وعدوں پر اس لئے بھی یقین کرنے کو تیار نہیں کہ حکومت اپنے مفادات کے پیش نظر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ پیش کرنے میں دیر ہی نہیں کرتی؛ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ گزشتہ دنوں جب پورے بلوچستان میں سردی کی شدت میں اضافہ ہوا تو سیکورٹی فورسز کے آپریشن کے باعث بے گھر ہونے والے خاندانوں کی مشکلات بھی بڑھیں جس پر حکومت بلوچستان نے اعتراف بھی کیا کہ 80 ہزار بے گھر افراد کی حالت موسم کے باعث خراب ہے اور حکومت کم وسائل کے باعث ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے، اس لئے حکومت نے اقوام متحدہ سے اپیل کی کہ ان بے گھر خاندانوں کو خوراک وطبی امداد فراہم کرنے میں مدد کی جائے۔ جب یہ بات میڈیا تک پہنچی اور حکومت کی رسوائی ہونے لگی تو بلوچستان حکومت کے ترجمان اپنے بیان سے منحرف ہو گئے۔ مگر سرکاری بیانات دینے اور پھر انحراف کرنے سے حالات تو نہیں بدل جاتے، اس لئے یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان میں جاری فورسز کی کارروائیوں سے متاثر ہونے والے ہزاروں خاندان آج شدید سردی میں کھلے آسمان تلے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ہم اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسف کی رپورٹ کو بھی نہیں جھٹلا سکتے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ 50 ہزار سے زائد

خواتین اور معصوم بچے غذائی قلت کا شکار ہیں اور اگر انہیں جلد امداد فراہم نہ کی گئی تو یہ صورتحال مزید خراب ہوسکتی ہے۔ یہ سب لوگ کسی ہمسایہ ملک سے آئے ہوئے مہاجرین نہیں ہیں بلکہ یہ اسی وطن کے اصل باشندے ہیں۔ ان کے اپنے گھر ہیں اور ان کے اپنے کھیت ہیں مگر اپنے گھروں میں سلامتی کا احساس نہ ہونے اور عدم تحفظ کا شکار ہونے کی وجہ سے یہ لوٹ جانے سے گھبرا رہے ہیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ان حالات میں بھی آپریشن جاری ہے اور حکومت طاقت کا بھرپور استعمال کر رہی ہے جبکہ حکومتی نمائندوں سے جب بھی دریافت کیا جائے تو وہ مسئلہ کا سیاسی حل چاہنے کی بات کرتے ہیں اس لئے یہ بات کسی بھی ذی شعور کے پریشان ہونے کیلئے کافی ہے کہ سرکار جو چاہتی ہے وہ آخر کرتی کیوں نہیں؟ کیونکہ جہاں تک مذاکرات' بات چیت اور مصلحت کا ذکر ہے تو بلوچ سے زیادہ اس کا احساس اور کسے ہوگا کیونکہ بلوچ تو حکومت کی تشکیل کردہ ہر کمیٹی سے مذاکرات کرتے رہتے ہیں، مگر تمام اجلاسوں کے بعد رپورٹ آنے سے قبل بلوچوں کی آواز کو کچل دیا جاتا ہے اور یہ عمل ابتداء سے جاری ہے۔ یہ تمام باتیں کوئی قصہ کہانیاں نہیں اور نہ ہی ماضی کا حصہ ہیں، یہ سب تو حال میں ہو رہا ہے۔ ابھی جب موجودہ حکومت میں بعض سردار سرکار کے سلامی ہوئے تو حکومت کو تین سردار ترقی میں رکاوٹ نظر آئے جن میں سے ایک کو نہ جھکنے کی سزا دی گئی، دوسرا نہ بکنے کی قید بھگت رہا ہے اور اب تیسرے کی باری ہے۔ مگر اس کے باوجود بلوچستان بھر میں مزاحمت جاری ہے۔ اگر حکومتی دعوے سچ ہیں کہ انہوں نے سرداروں پر' ترقی دشمنوں پر قابو پالیا ہے تو پھر یہ مزاحمت کون کر رہا ہے؟ کہاں سے ہو رہی ہے؟ کہیں اس بات میں تو صداقت نہیں جو سردار عطا اللہ مینگل نے اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی کہ ''ایک طرف حب، کراچی کے قریب ہے تو دوسری طرف گوادر، ایران کے نزدیک ہے، نوشکی، افغانستان کی سرحد کے پاس ہے تو ڈیرہ بگٹی اور جعفر آباد سندھ کے سنگم پر ہے اور پہلے جو بغاوت محدود تھی اب ایسا نہیں ہے' اب اس بغاوت میں مری' بگٹی' مینگل' کچکی ' رند' نوشیروانی' کھوسہ' بلیدی سب شامل ہیں۔'' قوم پرست رہنما کی بات کا مختصر مطلب یہی ہے کہ ان حکمرانوں کا جو فارمولا تھا کہ جہاں بیماری ہو جسم کے اس حصے کو کاٹ دو، ایسے کئی تجربات وہ کر چکے ہیں مگر بلوچستان میں جسم کے کسی خاص حصے میں تکلیف یا بیماری نہیں بلکہ یہ مرض اب پورے جسم میں پھیل چکا ہے اور وفاق کے نیم حکیم بے شک اپنے تمام نسخے آزمالیں مگر اب شفا کی بجائے ''خطرۂ جان'' کے امکان زیادہ ہوگئے ہیں۔

اگر حکمران بلوچستان کو واقعی اپنا اٹوٹ انگ سمجھتے ہیں تو اپنے اس انگ کا مرض کسی نیم حکیم کے

ذریعے ختم کرنے کی بجائے یہ کیس ماہرین کے حوالے کیا جائے اور بلوچستان کی قسمت کا فیصلہ یہاں کے عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو یہ جسم تندرست وصحت مند ہوسکتا ہے۔ کسی مرض کے متاثرین کو موت کا خوف دینے کی بجائے ہمیشہ زندگی کے سہانے خواب دکھائے جاتے ہیں، اس لئے مظلوم ومحکوم بلوچوں کو بھی آنکھیں دکھانے کی بجائے انہیں زندگی کی طرف' سالمیت وترقی کی طرف لانے کیلئے برابری کے لہجے میں برادرانہ بات کی جائے۔

(21 جنوری، 2007ء)

خوف زدہ لوگ اور ارتقائی عمل

ہم نے اپنے زمانہ بچپن میں کتابوں کے حوالے سے یہ سیکھا کہ سیکھنے اور سکھانے کا عمل کبھی بھی نہیں رکنا چاہئے اور ہمیشہ اپنے آپ کو عقل کا اکابر سمجھنے کی بجائے کام کو تقسیم کر کے اپنے دوستوں کا حلقہ تشکیل دیا جائے۔ان باتوں پر عمل کرتے ہوئے ہمارے ساتھیوں نے اپنے علم وعقل کی منتقلی کا سلسلہ شروع کیا مگر اس کے بعد ذہنی قحط کا ایک ایسا زمانہ آیا کہ سیکھنے اور سکھانے والوں نے سب دروازے بند کر کے ظاہری طور پر اپنے اوپر ایسے خول چڑھا لئے کہ ہر ایک خود کو ابوالعلم سمجھنے لگا جبکہ حقائق اس کے برعکس تھے۔ ایسے اندر سے خالی افراد نے اپنی جسمانی پھرتی ،زبان کے زور اور تعلقات کی بنیاد پر اداروں کے اختیارات سنبھال لئے تو پھر ان اداروں کی کارکردگی اور نتائج کے بارے میں اندازہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

سماجی سائنس کے ماہرین بھی ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں جو ہم نے 'سرخوں' سے سیکھیں، جن کے مطابق زمانہ قدیم میں یوں ہوتا تھا کہ کسی گاؤں میں اگر کوئی شخص مدرسہ سے دو درجے پڑھا ہوتا تو پورے گاؤں میں اس کے چرچے ہوتے تھے۔مسجد کے انتظامات بھی وہ سنبھالتا تھا تو گاؤں میں نکاح وجنازہ پڑھنا بھی اس کی ذمہ داری تھی، باہر سے آئے ہوئے خطوط پڑھ کر سنانا اور پھر ان کے جوابات لکھنا بھی اس کے کاموں میں شامل تھا۔علاوہ ازیں حکمت کا کام بھی وہی کرتا تھا۔مطلب یہ کہ ایک ہی شخص ہر فن مولا ہوتا تھا اور پورے گاؤں کا بوجھ اس کے کندھوں پر ہوتا تھا۔اس طرح پہلے شہروں میں بھی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر ضرورت کا تمام سامان ایک ہی جگہ مل جاتا۔مگر نئے دور میں صرف پڑھا لکھا ہونا کافی نہ رہا بلکہ انساں کی تیز ترین ترقی نے معاشرے میں مہارت کے نئے رستے تلاش کئے۔اب اپنے اپنے فن میں مہارت رکھنے والوں کو منفرد مقام حاصل ہونے لگا جس سے کم پڑھے لکھے اشخاص کی اہمیت کم ہونے لگی۔ اس دوران ایک ایسی نسل گزری جس نے علم وعقل ،سوچ وفکر کی منتقلی کو وقت کی ضرورت سمجھا۔مگر جب انسان کے فن اور انسانیت سے زیادہ ڈگریوں کو مقام ملنے لگا تو مختلف ڈگریوں کی وزن کے حساب سے

فروخت شروع ہوئی اور پھر ڈگریوں کے اس جمع بازار سے جاہل افراد نے من پسند ڈگریاں خرید کر اپنی جہالت کو چھپالیا۔ پھر سکھانے والوں کی سخاوت نہ رہی اور سیکھنے والوں نے اس عمل کو وقت کا زیاں سمجھا۔ یوں دستورِ زمانہ کے مطابق ہر شعبہ کی الگ الگ دوکان کھلی اوران دکانوں پر کسی شعبہ کے ماہرین کی بجائے ڈگری یافتہ افراد بیٹھ گئے۔

اب جولوگ بغیر علم کے اپنی گفتگو اور تعلقات کی بنیاد پر گزر بسر کر رہے تھے، ان کے اندر یہ خوف پیدا ہوا کہ اپنا فن منتقل کرنے سے ان کی جگہ چھن جائے گی اور وہ فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ خوف دراصل ان افراد کو لاحق ہوتا ہے جنہیں کوئی مقام کسی شارٹ کٹ سے حاصل ہوا ہوتا ہے جبکہ وہ اس لائق نہیں ہوتے۔ میں ایسے کئی افراد کو جانتا ہوں بڑی بڑی اسناد اور بڑی شخصیت کا تعارف رکھنے کے باوجود ہر فن مولا بنے ہوئے ہیں۔ اپنے علاقہ میں کوئی سماجی تنظیم بنے یا کوئی فلاحی ادارہ قائم ہو، صحافیوں کا گروپ تشکیل پائے یا ادیبوں کی تنظیم مطلب کہ کوئی بھی سرگرمی ہو یا عمل ہو، ایسے افرد ہر کام کے لئے صرف اور صرف اپنے آپ کو اہل سمجھتے ہیں۔ ایک اخبار کی نمائندگی سے لے کر بیرونِ ملک کسی ورکشاپ میں شرکت تک ایسے دوتین افراد سے زائد پورے شہر میں کوئی لائق شخص نہیں ہوتا۔ اندر سے خوفزدہ ایسے افراد نے انسانی ترقی کے عمل کو منجمد کر دیا ہے۔ ایسے افراد اپنے علم وعقل، سوچ وفکر، مہارت کی منتقلی نہیں کرتے جس کے باعث اپنے اپنے شعبہ میں کئی برس بیت جانے کے باوجود وہ اپنا کوئی متبادل پیدا نہیں کر سکے۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات تک محدود رہتے ہیں اور تمام سہولیات مراعات وفوائد صرف اپنی شخصیت کے لئے موزوں سمجھتے ہیں۔ اپنی ذات کے تنگ دائروں میں بند ان افراد کو آخر کون احساس دلائے گا کہ ان کے اندر کے خوف کی وجہ سے پورے معاشرے میں ارتقائی عمل جمود کا شکار ہو گیا ہے۔ ان کی غفلت ولاپرواہی کی وجہ سے آئندہ نسل کے نوجوانوں کی عمریں تو بڑھ رہی ہیں مگر ذہنی طور پر کھوکھلے انسان پیدا ہو رہے ہیں۔ اقتدار واختیار کے مالک تو ہمارے نوجوانوں کو نظر انداز کر کے انہیں محرومی وکمتری کے احساس میں مبتلا کر رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہر فن مولا قسم کے ادیب، دانشور، عالم واکابر تمام مواقع وعہدوں پر قابض ہو کر نئی نسل کو آگے بڑھنے سے روک کر ان کی حوصلہ شکنی کر رہے ہیں۔ ہم اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے صاحبانِ اقتدار پر تو غصہ ظاہر کرتے ہیں مگر اس جانب کبھی توجہ نہیں دی کہ کس خاموشی سے ہمیں ہمارے اپنے بھی محرومی میں دھکیل رہے ہیں۔ مختلف سرکاری وغیر سرکاری محکموں میں اپنا نوازی کی داستان لکھیں تو اقربا پروری کی پوری تاریخ شرمسار ہو جائے۔ یہ ذکر کسی اور موقع کے لئے چھوڑتے ہیں۔ موجودہ وقت کا یہ تقاضا ہے کہ ہم نئی نسل کے مواقع پر قابض ہونے کی بجائے ان کے لئے نئے مواقع پیدا کریں۔

(27 جنوری، 2007ء)

ایک تبدیلی کے لئے تیاری کا وقت

قومی جدوجہد میں سب سے بڑی رکاوٹ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں جو عالمی سامراج کے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے تیسری دنیا کے ممالک میں اپنے کاروبار کو وسعت دے رہی ہیں۔ یہ خیالات میرے نہیں بلکہ ایک کمیونسٹ رہنما کے ہیں جن سے گزشتہ دنوں ہماری ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو ہم نے ان سے بلوچستان، پاکستان اور پھر عالمی حالات پر کئی سوالات کئے۔ ان کے غلط اور درست جوابات کا فیصلہ تو قارئین پر چھوڑ دیں گے، ہاں البتہ ہم آپ کو شریکِ گفتگو ضرور کریں گے۔

ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں سیاسی قوتوں کا کوئی بنیادی نظریہ نہیں بلکہ اقتدار میں شراکت کی سب خواہاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ عالمی سرمایہ کاروں کو اپنے وطن میں خوش آمدید کہہ کر ہم قومی حقوق کی جدوجہد کو پیچھے دھکیل رہے ہیں اور ہم جو پورا وقت جمہوریت، جمہوریت کا راگ الاپتے رہتے ہیں، وہ جمہوریت ہم غریب محنت کشوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ جمہوریت میں تو سیاسی جاگیرداروں کو مزید مضبوط کیا جاتا ہے، انہیں پناہ دی جاتی ہے۔ جب ہمارے اپنے وسائل ملٹی نیشنل کمپنیوں کو لیز پر دیے جائیں اور ہم روزمرہ استعمال کی اشیا بھی ملٹی نیشنل کمپنیوں سے خریدنے پر مجبور ہوں تو پھر جمہوریت کی نہیں انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں انقلاب دشمن قوتیں روز بروز مضبوط ہو رہی ہیں۔ اس لئے مضبوط انقلاب کے لئے ایک مضبوط نظریہ اور پارٹی کی ضرورت ہے جو جمہوریت سے بہت آگے ہے۔

ہماری ملاقات کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سندھ کے صوبائی سیکرٹری ایڈووکیٹ کامریڈ رؤف کورائی سے ہوئی تھی جنہوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کارل مارکس کے اس جملہ سے کیا تھا ''دنیا کی تشریح تو سب نے کی ہے، مگر اصل ضرورت اس دنیا کو بدلنے کی ہے۔'' کمیونسٹ رہنما نے کہا کہ اب وقت آچکا ہے کہ دنیا بدلنے کے لئے کچھ کیا جائے، انہوں نے کہا کہ ماضی میں انقلاب رومانس رہا ہے جبکہ اب ہمیں اس رومانس

سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنا ہوگا اور انقلاب دوست و انقلاب دشمن قوتوں کی صف بندی کرنا ہوگی۔

بہر حال یہ خیالات تو ایک کمیونسٹ رہنما کے ہیں اور ہمیں نہیں معلوم ہے کہ اس صف بندی میں کون کہاں ہوگا، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ تبدیلی کو روکنا سیلاب کو روکنے کے مترادف ہے اور یہ کوشش جو کوئی بھی کرے گا وہ اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔ دنیا میں جس طرح امن دشمن قوتیں اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر دنیا کا سکون تباہ کر رہی ہیں اور طاقت کے زور پر قوموں کی تہذیب، ثقافت، ساحل، وسائل چھین کر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حوالے کیا جا رہا ہے، ان حالات میں مزاحمت وقت کی ضرورت ہے۔ جو جہاں ہے، جس محاذ پر ہے، وہاں سے اپنی آواز بلند کرے۔ ورنہ ترقی و تبدیلی کے نام پر جو ہمارا قومی تشخص ملیا میٹ کیا جا رہا ہے، اسے ہم بچا نہیں پائیں گے اور پوری قوم احتجاجی خودکشی کا شکار ہو جائے گی۔

اپنے وطن، اپنے لوگوں، اپنے وسائل، اپنے ساحل، اپنے قومی تشخص اور اپنے قومی وجود کا دفاع کرنے کو اگر انقلاب کہتے ہیں تو انقلاب ہی سہی مگر ہمیں اس تبدیلی کے لئے تیار ہونا ہوگا۔ بغاوت، مزاحمت اور بہادری کے قصے تو بلوچ ماضی کی میراث ہیں مگر ہم نے ہمیشہ اپنی میراث کا دفاع نہیں کیا۔ ہم بلوچ اپنی طرزِ رہائش میں خانہ بدوش ضرور ہیں کہ موسم کے لحاظ سے اپنے خیمے بدلتے ہیں مگر تعلقات میں ہم اپنے کوہساروں کی مانند ہر موسم میں ایک جیسے ہیں۔ ماضی میں پہاڑوں پر چڑھے ہمارے بزرگوں کو بے اعتمادی کی سولی پر لٹکایا گیا تو اب مذاکرات کے نام پر گولیاں برسائی گئیں۔ اقتدار پرست قوتیں جس طرح ماضی کے حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چل کر دھوکہ و فریب کی میراث کا دفاع کرتی ہیں، ہمیں بھی بغاوت، مزاحمت و بہادری کو سلامت رکھنا ہوگا اور اپنی جدوجہد سے اصل حکمرانوں کو یہ بتانا ہوگا کہ چند اشخاص کو منظر سے ہٹا دینے سے قومی تحریکیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ ہمیں اپنی سرزمین اور وسائل کا تحفظ کرنے کے لئے فیصلہ کن و موثر کردار ادا کرنا ہوگا اور قومی حقوق کی جدوجہد کو شخصیات کے محور تک محدود کرنے کی بجائے اس پیغام کو عام بلوچ تک پھیلانا ہوگا تاکہ آئندہ کسی نام نہاد ترقی کے عالمی ایجنڈا میں رکاوٹ بننے والے صرف تین سردار نہ ہوں بلکہ عام بلوچ ہوں کیونکہ اس سرزمین اور وسائل کے اصل وارث عام بلوچ ہی ہیں اور اپنے اس حقِ ملکیت کا تحفظ کرنے کے لئے ہمیں عام بلوچ کو ہی تیار کرنا ہوگا۔

(7 فروری، 2007ء)

منہگی ورکشاپس کے اغراض ومقاصد

اس ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اپنی ڈگری اور تعلیم کا کس طرح استعمال کرتے ہیں یہ تو وہی جانیں مگر ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہاں کے صحافی تعلیم اور ڈگری کے بغیر اس کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ایک صحافی درحقیقت رہنما ہوتا ہے جومختلف مسائل پر پوری قوم کی رہنمائی کرتا ہے۔ایک صحافی کی پیش کردہ رپورٹ سے پوری قوم صراط مستقیم پر گامزن ہوتی ہے یا پھر گمراہ ہوجاتی ہے اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایسے ذمہ دار واہم عہدہ کے حامل افراد کی تربیت کے لئے کوئی ادارہ موجودنہیں۔سیکڑوں نو جوان کہیں پر روزگار نہ ملنے کی وجہ سے تنگ ہوکر اپنی فراغت کوصحافت بنالیتے ہیں۔کتنی عجب بات ہے کہ دنیا کو باخبر رکھنے کا کام سرانجام دینے والے صحافی اکثر خود بےخبر ہوتے ہیں۔ان کی اس بےخبری کوختم کرنے کے لئے آج کل مختلف سماجی تنظیمیں فکرمند ہیں کیونکہ انہیں اپنے جاری پراجیکٹس کی تشہیر کے لئے میڈیا کی مدد چاہئے ہوتی ہے، اس لئے وہ تمام صحافیوں کو اپنے کام سے باخبر رکھنے کے لئے مختلف اوقات میں تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل جب بلوچستان میں ماں کی تولیدی صحت سے متعلق پیان پروجیکٹ کا آغاز ہوا تو صوبہ کے تین اضلاع جعفرآباد،کوئٹہ اور لسبیلہ کا انتخاب کیا گیا اور پراجیکٹ سے متعلق ان تینوں اضلاع کے صحافیوں کو آگاہی دینے کے لئے کراچی میں ایک تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈسٹرکٹ پریس کلب جعفرآباد کی خصوصی عنایت کے باعث مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔اس چارروزہ ورکشاپ میں ہم نے موضوع سے متعلق کیا کچھ سیکھا اس پرتو پھر کبھی لکھا جائے گا،اس وقت مجھے یہ بات بےقرار کررہی ہے کہ اندرونِ ملک کے چھوٹے شہروں سے صحافیوں کو بڑے شہروں میں بلا کر اعلیٰ ہوٹلوں میں رہائش دینے سے منتظمین تو بہتر بجٹ کی من پسند کاغذی کارروائی کرلیتے ہوں گے،صحافی بیچارے احساسِ محرومی وکمتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں کیونکہ اکثر صحافت سے وابستہ افراد کا تعلق ان خاندانوں سے ہوتا ہے جن کا معاشی پس منظر غیر مستحکم ہوتا ہے۔

کراچی میں صحافیوں کے تربیتی ورکشاپ کے دوران ہم نے جہاں بہت ساری معلومات حاصل کیں، وہاں طعام وقیام پر آنے والے اخراجات کا بھی بغور جائزہ لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب میں نے کیوں کیا یا تو میں پہلی مرتبہ ایسے موقع پر جا کر پریشان تھا یا پھر یہ سب میری سماجی اوقات سے زیادہ تھا۔ ان دونوں میں سے کچھ بھی ہو لیکن کاغذی بجٹ بنانے والوں کے لئے رکاوٹ بننا یا کسی کی دل آزدی کرنا میرا مقصد ہرگز نہیں۔ ہم کراچی میں جس ہوٹل میں رہائش پذیر تھے مجھے نہیں معلوم کہ وہ تھری اسٹار تھا کہ فائیو اسٹار مگر اس ہوٹل کی معیاری سروس ایسی تھی کہ ایک کمرہ کا یومیہ کرایہ چار ہزار روپے تھا اور چائے کے ایک کپ کی قیمت 60 روپے تھی۔ وہاں ورکشاپ کے منتظمین کی جانب سے ناشتہ، دوپہر، رات کا کھانا اور دوران ورکشاپ چائے دی جاتی تھی۔ ذرائع سے معلوم کیا کہ فی طعام پر فی کس چھ سو سے آٹھ سو خرچ ہوتے تھے اور ایک جوڑا کپڑے کی استری پر 80 روپے وصول کئے جاتے تھے۔ یوں میرے حساب سے ہر صحافی پر یومیہ پانچ ہزار خرچ کئے جارہے تھے۔ منتظمین کا ذاتی خرچہ اور لیکچر کے لئے آنے والوں کا یومیہ حساب اس کے علاوہ تھا، جو چار یوم تک لاکھوں میں بن رہا تھا۔ آخری دن پر تمام صحافی آنے جانے کے اخراجات بھی سواری کی بجائے چالاکی کا استعمال کر کے وصول کرتے رہے۔ اس موقع پر بھی میں اور میرے ساتھی اپنی سادگی کی وجہ سے مذاق کا نشانہ بنے کیونکہ ہم عام کوچ میں گئے اور ہمیں کوچ کا ہی کرایہ ملا۔

اس ورکشاپ اور اخراجات سے پراجیکٹ کو کتنی کامیابی ملے گی اور منتظمین اپنے مقاصد کہاں تک حاصل کرلیں گے، یہ میں نہیں جانتا۔ مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ لاکھوں روپے خرچ ہوجانے کے بعد بھی بلوچستان کی ماؤں کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ تمام رقم مذکورہ پراجیکٹ کے منتخب اضلاع میں براہِ راست خرچ کی جاتی تو شاید کچھ نتائج ضرور ہوتے اور سماجی تنظیموں کی جانب سے بڑے شہروں کے بڑے ہوٹلوں میں صحافیوں کو رہائش دے کر احساسِ محرومی میں مبتلا کرنے کی بجائے صحافیوں کے مالی حالات مستقل بنیادوں پر بہتر بنانے کے لئے کوئی مناسب اقدامات کئے جائیں تو بہتر ہوگا کیونکہ ان ورکشاپوں سے منتظمین مبینہ منافع تو حاصل کر سکتے ہیں مگر ماؤں کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ پراجیکٹ اگر براہ راست پریس کلبوں کے حوالے کئے جائیں تو تشہیر کی یہ مہم با آسانی ہوجائے گی اور بذریعہ صحافی یہ پیغام بھی جلد عام ہوگا۔ باقی کراچی میں ظاہری نمود ونمائش تو ضرور تھی لیکن ماؤں کی صحت کے متعلق نہ منتظمین فکرمند تھے اور نہ ہی آنے والے صحافیوں کو کوئی دلچسپی تھی۔ ورکشاپ کے بعد منتظمین بالکل غائب تھے، شاید انہوں نے اپنا مقصد پالیا تھا مگر یہاں کی ماں اب بھی صرف توجہ چاہتی ہے، صحت وعلاج چاہتی ہے جو مہنگے ہوٹلوں کے ورکشاپوں سے ممکن نہیں۔

(11 فروری، 2007ء)

انقلاب کا استقبال کرنا ہوگا

سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد عالمی طاقت کا توازن بگڑ گیا تھا۔ سرمایہ دارانہ بلاک نے دنیا بھر میں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ سوشلسٹ نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ مگر اکثریتی عوام کے حقوق کا تحفظ نہ کرنے کے باعث سوشلسٹ نظریے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور پوری دنیا میں کئی ممالک سرمایہ داری نظام سے مایوس ہوکر سوشلزم کی طرف واپس ہونے لگے جبکہ کیوبا اور وینیزویلا کی امریکہ دشمنی نے پوری دنیا کے سوشلسٹوں کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔ اسی جوش وجذبہ کے تحت گزشتہ روز بہت سارے کمیونسٹ جیکب آباد میں جمع ہوئے جہاں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے سیکرٹری جنرل کامریڈ خادم تھہیم ایڈوکیٹ اپنے کارکنوں کو موجودہ سیاسی صورتحال پر لیکچر دے رہے تھے۔

اس موقع پر انہوں نے کہا کہ 80ء کی دہائی سے کثیر القومی کمپنیاں یکجا ہونے لگی ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ، جاپان و جرمنی کا سرمایہ ایک ہوا ہے جس سے معاشی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اس لئے اب سیاست بھی ایک تبدیلی کیلئے متقاضی ہے۔ کامریڈ خادم کا کہنا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن نئے گلوبلائیزیشن نظام کی ایک تنظیم ہے جس نظام کے تحت صرف بڑے ممالک کو فائدہ ہوگا، باقی سب برباد ہو جائیں گے۔ اس لئے امریکہ، برطانیہ، بھارت و پاکستان میں کثیر القومی کمپنیوں یا ورلڈ بنک کے تنخواہ دار ملازم عوام کی مرضی کے خلاف حکمران بنادیے گئے ہیں۔ کمیونسٹ رہنما نے کہا کہ اس وقت ایک سو سے زائد کثیر القومی کمپنیاں موجود ہیں جن کا 80 فیصد ممالک پر مکمل کنٹرول ہے اور ملکی معیشت پر قابض ہونے کی وجہ سے وہاں سیاست بھی ان کے مفادات کی ہوتی ہے۔ کامریڈ خادم نے کہا کہ گلوبلائیزیشن نظام کے تحت این جی اوز کثیر القومی کمپنیوں کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں اور حکومت وہ تیسری قوت ہے جو ان کے منافع کیلئے ماحول بناتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سرمایہ داری نظام میں رائے، ووٹ، انسانی حقوق، اکثریت کا

احترام جیسی اخلاقیات اپنی اہمیت کھو چکی ہیں اور امریکہ و برطانیہ میں ایک بھی ادارہ ریاست کی ملکیت نہیں۔ یہی عمل یہاں دہرایا جا رہا ہے اور تمام ادارے پرائیویٹائیز کئے جا رہے ہیں۔ نئے نظام میں سرمایہ کے منافع اور لوٹ کھسوٹ کیلئے جغرافیائی حدود کی قید نہیں اور اب عوام کی صحت، تعلیم، روزگار، جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری بھی ریاست کی نہیں ہوگی بلکہ یہ تمام انتظامات ہر ایک کو خود ہی کرنے ہوں گے۔

کامریڈ خادم نے واضح الفاظ میں کہا کہ پاکستان میں رہنے والی چھوٹی قومیتوں کو نئے نظام سے مکمل خطرہ لاحق ہے کیونکہ موجودہ حکومت نے تو قومی وحدت کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے صوبائی خودمختاری سے بڑھ کر ضلعی خودمختاری دے دی ہے، اس لئے اب صوبائی خودمختاری بھی مسئلے کا حل نہیں بلکہ اپنے قومی تشخص کے ساتھ اپنے وسائل پر مالکانہ حقوق سمیت قومی خودمختاری وقت کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی حکمران عالمی سامراجی قوتوں کی خواہشات کے مطابق گلوبلائیزیشن نافذ کرنے کے ایجنڈا پر عمل پیرا ہیں اور طاقت کے زور پر تمام صوبوں کو اکٹھا کیا ہوا ہے۔ نیز یہاں انسانی حقوق، محنت کشوں اور انقلاب دوستوں سے بھی تصادم ہے جبکہ اس پورے خطے میں آزادی کی تحریک کو سب سے بڑا نقصان بنیاد پرستی نے پہنچایا ہے کیونکہ موجودہ دور میں امریکہ مردہ باد کہنا ایک فیشن سا ہو گیا ہے جبکہ سامراج دشمنی کے لئے صرف امریکہ کو گالی دینا ہی کافی نہیں۔ کامریڈ خادم نے کہا کہ پاکستان میں دو واضح رجحانات پائے جاتے ہیں؛ ایک وہ ہیں جو صرف امریکہ کو برا بھلا کہتے ہیں مگر مقتدرہ کو سلام پیش کرتے ہیں جبکہ دوسرے وہ ہیں جو مقتدرہ پر تو شدید تنقید کرتے ہیں مگر امریکہ سے ان کی راہ و رسم برقرار ہوتی ہے۔ ہمیں ان دونوں رجحانات کے خلاف عوام کو منظم و متحد کرنا ہوگا کیونکہ جو امریکہ مخالف تو ہے مگر سرمایہ داری کا حامی ہے، وہ کبھی بھی سامراج دشمن نہیں ہوسکتا۔

موجودہ دور میں مقتدرہ اور امریکہ کے خلاف لکھنا یا بات کہنا پہلے سے آسان ہو گیا ہے اور تحریر و تقریر کی مکمل آزادی کا تاثر بھی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہی جمہوریت ہوتی ہے کہ عوام کو دو وقت کی روٹی نہیں ملتی مگر روٹی کیلئے چیخنے چلانے کا مکمل حق دیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا جمہوریت و انسانی حقوق کے نام پر عوام کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنے سیاسی عمل سے عوام کی طاقت کا رخ بدلنا ہوگا اور راہِ نجات کی جانب گامزن ہونا ہوگا۔ ہمیں عوام کو یہ بتانا ہوگا کہ قومی محکومی، غلامی، وسائل سے محرومی و دیگر مسائل کا واحد حل انقلاب ہی ہے اور ہم سب نے مل کر اس انقلاب کا استقبال کرنا ہے۔

(28 مارچ، 2007ء)

ذکر اپنوں کا، جو ہمارے مستقبل کو تاریک کر رہے ہیں

بلوچستان رقبہ کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور بہت بڑے معدنی وسائل سے مالا مال ہے اس لئے اس وقت حکمرانوں کو صوبہ کی ترقی کی فکر کھائے جا رہی ہے، جسے یہاں کے اصل باشندے وسائل ہڑپ کرنے کی سازش سے قرار دے رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا خیال ہے کہ پورٹ تعمیر کرنے، سڑکیں بنانے اور چھاؤنیاں قائم کرنے سے ترقی نہیں ہوتی بلکہ ترقی کا بنیادی زینہ تعلیم ہے اور تعلیمی میدان میں بلوچستان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ لیکن آج تک کسی حکمران نے بلوچستان کی تعلیمی ترقی کا ذکر نہیں کیا کیونکہ بلوچ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے وسائل اور ساحل خود سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے جو کہ حکمران نہیں چاہتے۔ حکمرانوں کی نظر میں تمام ترقیاتی منصوبوں میں غیر مقامی افراد کو بھرتی کرنے کا نام ہی ترقی ہے اور تعلیمی پسماندگی کا حوالہ دے کر وہ یہاں کے اصل باشندوں کی اس ترقی میں شریک ہونے سے روکنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں کے تمام تر دعوؤں کے باوجود بلوچستان میں اب بھی ایک ہزار کے قریب ایسے سکول ہیں جن کی کوئی عمارت نہیں اور ان میں سے 18 تو صرف صوبائی دارالحکومت کوئٹہ میں ہیں۔ صوبائی اسمبلی میں مفت تعلیم کی قرارداد تو پاس ہوئی تھی مگر ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس پر عمل نہیں ہو سکا۔ اس کی بنیادی وجہ محکمہ تعلیم کے وہ ٹھیکیدار ہیں جو کتابوں کی اشاعت سے لے کر ترسیل تک کا کام کرتے ہیں۔ جس طرح سرکاری کاغذوں میں اسکولوں کو اسٹیشنری، چاک، ٹاٹ و دیگر ضروریات کیلئے فنڈز ریلیز کر دیے جاتے ہیں جبکہ ہر سکول میں حقائق اس کے برعکس ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح اگر سامان کیلئے ایک کروڑ کا فنڈ ریلیز ہوتا ہے تو ٹھیکیدار کاغذوں میں اسی لاکھ کا ظاہر کر کے اصل سامان صرف 20 لاکھ کا پہنچاتا ہے، باقی رقم نیچے سے اوپر تک ملی بھگت سے ہڑپ ہو جاتی ہے، کتابوں کیلئے بھی اسی طرح ہوتا

ہے کہ اگر ایک ڈسٹرکٹ کیلئے ایک لاکھ درسی کتب کی منظوری ہوئی ہے تو ٹھیکیدار 20 ہزار کتب سکول تک پہنچاتا ہے، باقی 80 ہزار کتابیں یا تو چھپتی ہی نہیں یا پھر سرکاری مہر کے بغیر شائع کر کے فروخت کیلئے مارکیٹ میں بھیج دی جاتی ہیں۔ اس کام میں نیچے سے اوپر تک سب ملوث ہوتے ہیں اور یہ مکمل منصوبہ سازی ہوتی ہے کہ مفت کتب کی ترسیل اتنی تاخیر سے ہوتی ہے کہ اکثر طلبہ مارکیٹ سے کتابیں خرید چکے ہوتے ہیں۔

ایک سروے رپورٹ کے مطابق صوبائی حکومت اس سال کچی کلاس کیلئے 299863' پکی کلاس کیلئے 175353' دوسری جماعت کیلئے 133956' تیسری جماعت کیلئے 99561' چوتھی جماعت کیلئے 85501' پانچویں جماعت کیلئے 78366' چھٹی کلاس کیلئے 50208' ساتویں کیلئے 39848' آٹھویں 35779' نویں جماعت کیلئے 28460 اور دسویں جماعت کیلئے 24175 مکمل کتابوں کے سیٹ مفت فراہم کرنا چاہتی ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ محکمہ تعلیم کے پاس کتب کا ذخیرہ جمع کرنے کیلئے کوئی موزوں گودام بھی نہیں اور اضلاع کے ای ڈی اوز اپنی کتب لے جانے کو تیار نہیں، اس لئے محکمہ تعلیم کے اسٹوروں میں انبار لگی کتب کے خراب ہونے کا خطرہ ہے جس سے نہ صرف مستحق طلبہ کی مفت کتب سے محرومی ہوگی بلکہ قومی دولت کا بھی ضیاع ہوگا۔ یوں تو صوبہ بھر میں 7457 بوائز پرائمری اسکول' 2886 گرلز پرائمری سکول' 553 بوائز مڈل سکول' 253 گرلز مڈل سکول' 437 بوائز ہائی سکول جبکہ 131 گرلز ہائی سکول ہیں' لیکن ان تمام سکولوں میں بھی سہولیات کے فقدان کی شکایات عام ہیں۔ تربت کے 28 سکولوں میں تو ایک بھی سائنس لیبارٹری نہیں اور نہ ہی کوئی سائنس ٹیچر ہے۔ محکمہ تعلیم میں بدعنوانی' کمیشن اور اقربا پروری کا ایسا بازار گرم ہے کہ گریڈ ایک سے 9 تک اساتذہ کی تعیناتی کا مبینہ ریٹ 30 سے 60 ہزار روپے' گریڈ 9 تا 16 کا ریٹ 60 ہزار تا ایک لاکھ روپے مقرر ہے، جبکہ ایک تازہ ترین سروے کے مطابق صوبہ بھر میں 6 ہزار اساتذہ ایسے ہیں جو یا تو ڈیوٹی دیتے ہیں یا نہیں یا پھر مقتدر لوگوں کے ساتھ رہنے کے باعث وہ ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، تاہم تنخواہ وہ ہر ماہ پابندی سے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح گھر بیٹھے تنخواہ حاصل کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد اساتذہ یونین سے وابستہ ہے جبکہ جھل مگسی میں کوئی لیڈی ٹیچر ڈیوٹی پر نہیں آتی اور تنخواہ بھی حاصل کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ڈیرہ مراد جمالی کی گوٹھ خیر محمد اسکول کا استاد دبئی چلے جانے کے باوجود ہر ماہ تنخواہ حاصل کرتا ہے۔

سیاسی وقبائلی اثر ورسوخ پر ہونے والی بھرتیوں کا پردہ اس وقت چاک ہوتا ہے جب گزشتہ روز ایک محکمہ فیڈرل ایجوکیشن اسلامک ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے جعفر آباد کیلئے انتظامی و تدریسی 161

اسامیوں کا اعلان کیا گیا۔ 194 خواتین اور 796 مرد کی اسامیوں کیلئے انتہائی خاموشی سے یکم مارچ کو انٹرویو کئے گئے۔ ضلعی انتظامیہ نے وقت سے قبل ہی اساتذہ یونین کی 'دُکھتی رگ' پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ اسامیاں ان کے حوالے کر دیں۔ اس طرح معاملے کو ہر طرح سے مخفی رکھا گیا اور اہم عہدوں پر اپنے عزیز و اقارب کی تقرری کی گئی۔ یہاں تک کہ اساتذہ یونین جی ٹی اے کے صوبائی صدر دفتر کے فرزند' بہو سمیت ایک خاندان کے 6 افراد کو منتخب کر لیا گیا جس کے عوض اساتذہ یونین نے خاموشی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد جب ضلع انتظامیہ کو ای ڈی او تعلیم اور صحافی برادری کے شور مچانے کا خوف ہوا تو انہیں بھی ان کی اوقات کے مطابق حصہ دیا گیا، مگر جب اہل افراد نظر انداز ہوئے تو بات کمروں سے نکل کر بازار تک پہنچی اور مقامی سطح پر یوتھ فورم اور صوبائی اسمبلی کے سابق اسپیکر میر ظہور کھوسہ نے شدید احتجاج کیا جسے ضلعی انتظامیہ نے یہ کہہ کر در گزر کر دیا کہ انہوں نے کوٹہ طلب کیا تھا جبکہ ہم نے خالص میرٹ پر تقرریاں کی ہیں۔ بہر حال 3 مارچ کو ادارہ کے چیئر مین رفیق چیمہ اور ڈائریکٹر خیر النسا نے منتخب افراد میں ملازمت کے آرڈر تقسیم کئے۔ یہ سارا قصہ اس وقت حیرت کی حدوں کو پہنچتا ہے جب مقامی محکمہ تعلیم فیمیل کے ایڈمن آفیسر منتخب ہونے والی 34 خواتین کو طلب کرتے ہیں اور 6 مارچ کو تربیت کے بہانے صرف خواتین کو ایک کوچ میں سوار کر کے سندھ کے شہر سہون لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان خواتین کی روانگی کی خبر ہوتے ہی اساتذہ یونین کے صوبائی صدر' ضلعی صدر و دیگر بااثر افراد متحرک ہو جاتے ہیں اور کوچ کا تعاقب کر کے اپنی عزیز خواتین کو صحیح سلامت گھر واپس لاتے ہیں۔ ایڈمن افسر کے مطابق اس کام کیلئے ضلع ناظم نے زبانی حکم دیا، ڈی سی او نے گاڑی کا بندوبست کر کے 21 ہزار روپے کرایہ دیا اور ڈی پی او نے کوچ کو سیکورٹی فراہم کی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اساتذہ یونین نے اس سارے معاملے کی پردہ پوشی کر دی۔

علاوہ ازیں منتخب افراد کے آرڈر تبدیل کرنے کی شکایات بھی ملی ہیں کہ ایک شخص اگر ساتویں گریڈ میں منتخب ہوا ہے تو کسی اور سے لین دین کر کے اسے چوتھا گریڈ دیا گیا ہے۔ صوبہ کے محکمہ تعلیم میں بدعنوانی' کمیشن' اقربا پروری کی یہ تو ایک جھلک ہے۔ بغیر عمارت' سہولیات و اساتذہ کے ہم اپنی آئندہ نسل کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اگر ان باتوں کی گہرائی تک جائیں گے تو ان تمام امراض کے محرکات کوئی غیر نہیں بلکہ اپنے ہی نظر آئیں گے۔ ہم اپنی سرزمین و وسائل پر قابض ہونے والوں کو تو قومی غدار کہتے ہیں لیکن اپنے روشن مستقبل پر گہن لگانے کا دوش آخر ہم کسے دیں گے؟

(4 اپریل، 2007ء)

انسانوں کی جبری گمشدگی میں سرفہرست بلوچستان

ہم جب بھی سرکاری اداروں میں ملازمتوں کے اعداد وشمار جمع کریں گے تو بڑے بھائی کا حصہ سب سے زیادہ نظر آئے گا مگر جب محرومیوں کا ذکر ہوگا تو بلوچستان سرفہرست ہوگا اور سیاسی قیدیوں میں تو بلوچستان کے مقابل کوئی بھی نہیں۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کیلیئے کام کرنے والے ادارے ایچ آر سی پی نے گمشدہ سیاسی کارکنوں کی بازیابی کیلیئے سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پورے ملک میں سے 148 سیاسی کارکن غائب کر دیے گئے ہیں، جن میں صرف 6 واپس ہوئے ہیں۔ اس تعداد میں 23 سندھ، 10 سرحد اور 10 پنجاب سے وابستہ ہیں جبکہ اکثریت 103 کا تعلق بلوچستان سے ہے۔ ایچ آر سی پی کی یہ پٹیشن غیر فعال بنائے جانے والے چیف جسٹس کے دنوں میں دائر ہوئی تھی اور اکثر تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ اس مقدمہ میں خفیہ ایجنسیوں کے ملوث ہونے کے امکان کے باعث چیف جسٹس کو قربان کیا گیا جبکہ جسٹس جاوید اقبال کا اب بھی یہی کہنا ہے کہ کوئی بھی خفیہ ایجنسی آئین وقانون سے بالاتر نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کیس کی سماعت ہر حال میں جاری رہے گی۔

ایچ آر سی پی نے ملکی قانون و آئین کے آرٹیکل 184 (3) کے تحت داخل پٹیشن میں وفاقی حکومت، وزارتِ دفاع اور چاروں صوبائی حکومتوں کو فریق بنایا ہے اور موقف اختیار کیا ہے کہ کیا کسی آزاد ملک کے شہری کو قانون نافذ کرنے والے ادارے یا خفیہ ایجنسیاں بغیر کسی سبب اور الزام کے دھر سکتی ہیں اور کیا ان اداروں کو یہ اختیار ہے کہ کسی بھی شخص کی گرفتاری ظاہر کرنے کی بجائے انہیں منظر سے غائب کر دیا جائے۔ پٹیشن میں بتایا گیا ہے کہ گمشدہ کارکنوں کی اکثریت کا تعلق قوم پرست جماعتوں سے ہے جبکہ آئین کے آرٹیکل 8,9,10,11,13,14,15 ملک کے ہر شہری کے بنیادی حقوق کو تحفظ فراہم کرتے

ہیں۔کمیشن برائے انسانی حقوق کے مطابق 2000ء سے 2007ء تک پورے ملک میں گم ہونے والے سیاسی کارکنوں میں اکثریت کا تعلق بلوچستان سے ہے جبکہ سندھ کے 23 افراد میں بھی اکثر قوم پرست جماعتوں کے کارکن ورہنما شامل ہیں، جن میں ڈاکٹر صفدر سرکی، آصف بالادی، جی ایم بھاگت، صحافی مہر الدین مری قابل ذکر ہیں جن کی بازیابی کیلئے بڑے بڑے احتجاج بھی ہوئے ہیں۔اسی طرح بلوچستان سے غیر قانونی گم کئے جانے والوں میں علی بیگ مری، عالم پرکانی، فیاض مری، ہاشم پرکانی، اصغر بنگلزئی، علی احمد مری، نیاز بگٹی، حنیف بگٹی، اللہ بخش مینگل، جعفر مینگل، غلام رئیسانی، لعل بخش مری سمیت 103 سیاسی کارکن شامل ہیں اور قابلِ حیرت بات یہ ہے کہ ان تمام میں سے اکثریت کا تعلق مری قبیلہ سے ہے۔

ایک طرف آئین وقانون کی بات ہوتی ہے تو دوسری طرف بغیر کسی جرم کے اتنے سارے شہری غائب ہیں۔جب گزشتہ روز سندھ کے وزیر اعلیٰ کی ایک خاتون مشیر سے اس معاملہ پر پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ان کارکنوں نے ضرور کچھ تو کیا ہوگا ورنہ کچھ نہ کرنے والے تو آزاد ہیں۔خاتون مشیر نزہت پٹھان کا تعلق حیدر آباد سے ہے اور وہ زمانہ طالب علمی سے پیپلز پارٹی سے وابستہ رہی ہیں۔گزشتہ انتخابات میں وہ خواتین کی مخصوص نشستوں پر پیپلز پارٹی کی جانب سے سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں اور ابھی کچھ ماہ قبل وہ اپنی سیاسی جماعت سے منحرف ہوکر سرکاری جھنڈے کے سائے میں آچکی ہیں۔ہم ان کے جواب کی تائید کرتے ہیں کیونکہ ماضی کے ہر دور میں جب بھی جس نے بھی 'کچھ نہ کچھ کرنے' کی کوشش کی ہے، اس کی سزا انہوں نے ضرور پائی ہے اور 'کچھ بھی نہ کرنے والے' اس مشیر کی طرح ہر دور میں سلامت رہے ہیں جبکہ اپنے وطن اور لوگوں کی خوشحالی کے خواب دیکھنے والے اپنی سلامتی کو قربان کردیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے وسائل، سرزمین ودیگر حقوق سے متعلق آگاہی اور آئینی تحفظ لیئے جدوجہد اگر کوئی جرم ہے تو پھر ایسے مجرموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے لیکن انہیں یوں منظر سے غائب کردینا آئین وانصاف کے مطابق نہیں۔اس لئے ایچ آر سی پی کی طرح پورے ملک کے باشعور افراد، بلوچستان کے عوام اور خصوصاً ان کارکنوں کے اہلخانہ ملک کی اعلیٰ عدالت سے پُر امید ہیں کہ معصوم انسانوں کی گمشدگی پر نوٹس لیتے ہوئے اس عمل کو ہمیشہ کیلئے بند کیا جائے گا، کیونکہ ایک انسان کی گمشدگی سے پورے خاندان ویران ہوجاتے ہیں اور نسلیں گمراہ ہوجاتی ہیں، اس لئے آئندہ نسل کے راہِ راست پر آنے کے لئے ان انسانوں کی بازیابی لازم ہے۔

(5 اپریل، 2007ء)

کیا بیروزگاری نظریات بدلتی ہے؟

ایک زمانہ تھا جب پورے ملک میں سیاسی جماعتوں کا سحر تھا اور بائیں بازو کی جماعتیں مکمل سرگرم تھیں' ان کے کارکن نظریات عام لوگوں کے آئیڈیل ہوتے تھے، ہر شخص اپنے نظریات سے سچی وابستگی کا نمونہ ہوتا تھا۔ شہر شہر میں رات کے اندھیروں میں ٹولیوں کی صورت میں وال چاکنگ کے لئے نکلنا قابلِ فخر ہوتا تھا، جبکہ اس سے قبل استعمال شدہ سیاہ ڈیزل کا بندوبست کرنے کی ذمہ داری بھی خاص لوگوں کو سونپی جاتی تھی' پھر پوسٹر آویزاں کرنا، بینر لگانا یہ سب کام ہر کارکن کرنے کی خواہش رکھتا تھا' سرخ سیاست' میں تو چند ایسے افراد بھی سرگرم تھے جو ہر وقت اپنا سفری بیگ ساتھ رکھتے تھے اور مختلف شہروں دیہات وقصبات کے تنظیمی دورے کرنا ان کی ذمہ داری میں شامل ہوتا تھا۔ پھر میلے کچیلے کپڑے پہنے وہ کسی بھی شہر پہنچتے تو میزبان دوست کے فرائض میں یہ بھی شامل ہوتا کہ وہ نہ صرف مہمان کے طعام و قیام کا بندوبست کرے بلکہ ان کے کپڑے بھی گھر سے دھلوائے اور طے شدہ پروگرام کے تحت نئے شہر تک جانے کیلئے مہمان کے کرائے کا بھی انتظام کرے۔ اس دوران لیکچر، تقاریر کے ذریعے اپنے نظریات کا پرچار بھی کیا جاتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام کام سیاسی کارکن بلا معاوضہ کرتے تھے اور ہر کارکن اپنے لئے فخر سمجھتا تھا کہ یہ ذمہ داری کبھی ان پر آئے۔

جب سیاسی کارکن ملک بھر میں پھیلنے لگے اور ان کے نظریات کا پرچار بھی عام ہونے لگا تو صاحبانِ اقتدار خوفزدہ ہوگئے۔ عام لوگ جب باشعور ہوئے تو وہ اپنے حقوق مانگنے لگے جس سے ایوانوں میں بیٹھنے والوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور یوں شعور کے اس سفر کو طاقت سے روکنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف سیاسی جماعتوں پر حملے ہوئے اور سیاسی کارکنوں وریاست کے مابین تصادم ہوئے مگر اس ٹکراؤ میں سیاسی نظریات وکارکنوں کی جیت ہوئی اور ریاست شعور کے اس سفر کو روکنے میں ناکام ہوئی بلکہ سیاسی کارکنوں کی

تعداد میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ بعدازاں عالمی طاقتوں نے اس خطہ کا خاص معاشی مشاہدہ کیا اور تجزیہ کیا کہ یہاں کے لوگوں کا اصل مسئلہ معاشی ہے اور پھر ایک سازش کے تحت سیاسی جماعتوں کو جاہلوں کا اکھاڑہ بنایا گیا۔ سیاسی کارکنوں کو اسٹڈی سرکل سے نکال کر بھتہ خوری، کمیشن اور دیگر بدعنوانیوں کے کام پر لگا دیا گیا۔ ریاست نے حقوق سلب کئے، روزگار سے محروم کیا اور مختصر عرصہ میں بیروزگار نوجوانوں کی ایک فوج تیار ہوگئی تو گرم لوہے پر چوٹ لگاتے ہوئے ملک بھر میں این جی اوز کا نیٹ ورک سرگرم کیا گیا جہاں پر سیاسی کارکنوں کو ملازمتیں ملنے لگیں اور جو کام وہ فاقہ کشی میں بلا معاوضہ کرتے تھے، اب انہیں اسی کام کا معاوضہ ملنے لگا اور یوں ہر کام کی اُجرت کا انتظار کرنے لگ گئے، جس سے پورا معاشرہ نظریاتی و باشعور سیاسی رضا کاروں سے محروم ہوگیا۔

اب عالمی ایجنڈہ پر تمام سیاسی کارکنوں کو غیر سیاسی کر دیا گیا ہے اور بیرونی معاوضوں پر کام کرنے والے کارکن سوچنے لگے ہیں ان کا ماضی فضول تھا، وہ تمام عمر جو کام دیوانوں طرح کرتے رہے اب اُسی کام کیلئے انہیں ہزاروں بلکہ لاکھوں میں اُجرت ملتی ہے۔ ان سوچوں کے درمیان آج اگر کسی سے سیاسی بحث کی جائے تو جلتی پر تیل پھینکنے کے مصداق ہوگا کیونکہ آج این جی اوز نے سیاسی کارکنوں کا معاشی مسئلہ حل کر دیا ہے۔ کل تک جس سیاست پر ان کے اہل خانہ کو پریشانی ہوتی تھی، آج اپنے فرزند کے باعث وہ خاندان خوشحال ہے۔

تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیاسی جماعتوں کو اپنے پرانے کارکنوں کے روزگار کی مخالفت کرنی چاہیے، ان کو بیروزگاری کے اندھیروں میں پھر سے دھکیلنا چاہیے اور ایک سیاسی کارکن کی اپنے خاندان میں بنی ہوئی عزت کو کیا خاک میں ملا دینا چاہیے؟ یہ اور ایسے بہت سارے سوالات میری طرح ہر کارکن کے ذہنوں کو جھنجھوڑتے ہوں گے اور بہت کم ایسے کارکن ہیں جواب بھی کسی تبدیلی کا محرک سیاست کو ہی سمجھتے ہیں جبکہ بہت سارے کارکن اپنے ماضی پر شرمندگی کا اظہار کر کے دونوں ہاتھوں سے پیسہ جمع کرنے کی دوڑ میں شریک ہیں۔ آج کا معاشرہ ایک نئی بحث کا متقاضی ہے کہ اس خطہ کو غیر سیاسی بنانے کے عالمی ایجنڈہ میں کہیں ہم بھی شریک تو نہیں اور کیا محض روزگار کی خاطر ہم اپنے ماضی، اپنی سچائی، اپنے نظریات سے دستبردار ہو جائیں؟ آئیں، سوچیں کہ پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کرنے کا سلسلہ بحال کیا جائے یا نئے راستوں پر سفر کا آغاز کیا جائے۔

(9 اپریل، 2007ء)

اب عوام ہی نظام بدلیں گے

عام طور پر ہمارے ہاں اس دھرتی کے سینے پر قائم درجنوں سیاسی و مذہبی جماعتیں اوران کے نام نہاد لیڈر نعرہ تو با آسانی لگاتے ہیں لیکن وہ عوام کو درپیش حقیقی و بنیادی مسائل کا حل تلاش نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں کئی فرسودہ نظام ڈنڈے کے زور پر عوام پر لاگو کردیے گئے ہیں۔ان درپیش مسائل کے حل کے لئے سیاسی کھوکھلے نعروں کی ضرورت اب نہیں رہی۔نعروں کے پجاری سیاسی و مذہبی لیڈر عوام کو ہرگز اس سے آگاہ نہیں کرتے کہ اس جدید سائنسی دور میں ،اس نظام کی صورت میں لاگو فرسودہ سسٹم سے جان کیسے چھڑائی جائے؟اس سماج اور نظام میں کونسی بنیادی خرابیاں ہیں؟اس نظام کو کیسے تبدیل کیا جائے؟اس نظام اور سماج کا بنیادی ڈھانچہ کیا ہونا چاہیے؟اوراس نظام میں اگر کوئی نیا قانون پاس بھی کیا جاتا ہے تو اس کی بنیاد کیا ہونی چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قائم یہ مذہبی وسیاسی پارٹیاں محض نعروں کی سیاست میں انرجی ضائع کررہی ہیں۔اس ملک میں جو رہنما نظام کی تبدیلی کا نعرہ لگاتے ہیں، ان کے ہاں نظام کی تبدیلی کے لئے ماسوائے نعرے کے عملی جدوجہد کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی اس مقصد کے لئے عوام کو سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔

فرسودہ رسم ورواج کو توڑنے کے لئے کسی کے پاس بھی موثر پروگرام نہیں۔ معاشرے میں یہ نام نہاد سیاسی ومذہبی پارٹیاں اوران کے رہنما فرسودہ رسم ورواج میں کوئی بنیادی تبدیلی چاہتے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں ایسی کوئی بھی سیاسی یا مذہبی جماعت یا ایسا رہنما اس ملک کی سرزمین پر نمودار ہی نہیں ہوا جس کے پاس اس نظام میں موجود غیر قانونی رسم ورواج کے خلاف اور مختلف نظاموں سے متعلق سائنسی نظریہ ہو اور وہ ہمیں یہ بھی بتائے کہ یہاں کون سی خامیاں اور خرابیاں پائی جاتی ہیں' نیز ان کا حل کیا ہے؟ ہمیں یہ بھی واضح کرکے بتائے کہ اس ملک کو فرسودہ نظام اور جاگیردارانہ نظام نے ہمیں بدحالی، غربت ،قرض اور بدعنوانیوں کی تاریکیوں اور دلدل میں کیسے پھنسایا ہے اور غریب ومسکین لوگوں کے مسائل کیوں حل نہیں ہورہے؟ ایسا کوئی محسن اور محکوم عوام وان کی دھرتی کے لئے نیلسن منڈیلا کی طرح، آنگ سان

سوچی کی طرح اپنی زندگی وقف کردے۔ حقیقت پسندی وعملیت پسندی سے نیا نظام رائج کر کے تمام اقوام اور صوبوں کو ایک جتنے حقوق مہیا کرے۔

اس ملک میں محض انگلیوں پر گننے جتنے لیڈر ملکی تاریخ میں منظر عام پر آنے سے پہلے یا تو پھانسی گھاٹ پر چڑھائے گئے یا تو گولیوں کی خوراک بن گئے۔ جن کے پاس ملک کی بقا اور بہتری کے لئے نظریہ اور فلسفہ موجود تھا، وہ محض نعروں پر یقین رکھنے والے نہ تھے۔ انہوں نے نظریات اور فلسفوں کو اپنی عام رواجی زندگی میں بھی قانون کی طرح لاگو کردیا تھا۔ ایسے سچے اور کھرے سیاستدانوں ورہنماؤں کے پاس عوام کی بھلائی کے بہت سارے رہنما پروگرام تھے۔ انہوں نے عوام کی خدمت عبادت سمجھ کر کی تھی۔ اب ہمیں ایسے لیڈروں اور رہنماؤں کی اشد ضرورت ہے جو غربت بھوک اور بدحالی کے مزے سے واقف ہوں، جنہیں ننگے تن اور بھوکے پیٹ بچوں کے رونے اور معصومیت کے ساتھ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے روٹی کے ٹکڑے مانگنے کا ہر لمحہ یاد ہو۔ وہ جنہوں نے فرسودہ اور ناقص نظام کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے سختیاں جھیلی ہوں۔ ان کی نسبت ایسے لیڈر جو 2000 سے 3000 گز کے لگژری بنگلوں میں رہتے ہوں، جو ایک غریب کے گاؤں میں عیادت کے لئے جانے کے بعد پورا مہینہ ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں اپنی تھکن اتارتے پھریں، جو غریب اور مفلس لوگوں سے مجبوراً ہاتھ ملانے کے بعد تین گھنٹوں تک ہاتھ دھوتے رہے۔ وہ ملک میں رائج فرسودہ نظام، ناانصافیوں اور غربت کا خاتمہ ہرگز نہیں لائیں گے اور نہ ہی لاسکیں گے۔ وہ کیسے انقلابی جدوجہد اور انقلاب کے نظریے پر عمل درآمد کروائیں گے۔ ان کے ہاں تو انقلاب اپنے نظریہ ضرورت کے تحت استعمال کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ وہ کیونکر چاہیں گے کہ اپنی فکر، فلسفے اور عملی جدوجہد کے ذریعے اس ملک کے محکوم عوام کو راہِ نجات دلانے کے لئے انقلاب کا راستہ دکھائیں گے، اب ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔

اس ملک میں اگر کوئی بھی سچا اور سیدھی راہ دکھانے والا لیڈر اب رہا نہیں یا نہیں آنے والا تو پھر ہم عوام جاگیر، پیر اور میر کی میراث بن کر کس لئے ان کی ناجائز خواہشات اور نظریہ ضرورت کا سہارا بنتے رہیں۔ ہم یہ عہد اور عزم کیوں نہ کریں اب ہم انہی لیڈروں کو اپنا رہنما بنائیں گے جو حقیقت پسندی اور عملیت پسندی کے حامی ہوں گے، کہ حقیقت پسندی اور عملیت پسندی ہمارے لئے اس فرسودہ استحصالی نظام سے نجات کا ذریعہ بنے گی۔ ملک کے غریب اور محکوم 93 فیصد معاشرے کو خوشحال بنانے کی بجائے مزید ابتری کی دلدل میں دھکیل دیا گیا ہے۔ سیاست ہمارے ہاں آباؤ اجداد سے وراثت کی طرح منتقل ہوتی آرہی ہے۔ اس نظام کو بدلنے کے لئے اب ہم عوام کو خود کچھ سوچنا ہوگا۔

(18 اکتوبر، 2007ء)

اپنے ہونے پر فخر کرنا

انسان تو انسان ہی ہوتے ہیں۔ دو ہاتھ، دو پیر، دو آنکھیں، ایک ناک، ایک دل اور ایک دماغ والے لیکن پھر بھی انسانوں کے اس پر ہجوم جہان میں انسان ہو کر جینا بھی جوانمردی سے کم نہیں۔

پیٹ پالنا، بچے پالنا، گھر بنانا، دھوپ چھاؤں سردی گرمی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنی حفاظت کرنا، مفادات کے حصول کے لئے ایک دوڑ لگانا، صرف انسان ہی نہیں کرتا، یہی کام ایک جانور بھی انجام دیتا ہے۔ مرغی بھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔ گرمی سردی اور خوف سے بچنے کے لئے اپنے پَر پھیلا کر بچوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ بچوں اور اپنے پیٹ پالنے کے لئے کون سا جانور ہے جو بھاگ دوڑ نہیں کرتا۔ پیٹ بھر کر کھانا اور سر چھپانے کے لئے چھت سمیت دیگر موسمی اثرات سے بچاؤ کے لئے کوشش جانوروں کا بھی کام ہے۔ تمام جاندار اپنی جان کو عزیز رکھتے ہوئے روٹی، کپڑا اور مکان کے حصول کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ تمام کام ایک جاندار ہونے کے ناطے انسان کو بھی انجام دینا پڑتے ہیں جو اشرف مخلوق بھی ہے۔ انہی کاموں کی انجام دہی کی وجہ سے اسے 'سماجی جانور' (Social Animal) ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ لیکن انسان کی عظمت کی تلاش میں آپ کو بہت ورق گردانی کرنا پڑے گی۔

سیاسی لوگ تو موسم کی طرح وقت اور حالات کے مطابق سیاسی موسم کو دیکھ کر اپنے نعرے، منشور اور پروگرام تبدیل کر دیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو تبدیلیِ موسم کو بھی مات دے دی ہے۔ یہ موسم سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ وفاداریاں تبدیل کر دیتے ہیں۔ بلوچستان جیسا کہ وسائل سے مالا مال صوبہ ہے' یہاں کسی چیز کی کوئی کمی نہیں' یہاں تک کہ موسم سے زیاہ تیز رفتاری کے ساتھ تبدیل ہونے والے سیاستدانوں میں بھی بلوچستان خود کفیل ہے۔ بلوچستان میں بھی ایسے سیاسی افراد کی کوئی کمی نہیں جو کبھی عوام

کو تو کبھی خواص کو خوش کرنے کی کوششوں میں اپنے بیانات اوراعلانات تبدیل کر کے اپنے مقاصد اورمفادات کے حصول کے لئے ہر ممکن طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ جب عوام سے مخاطب ہوں، ان کے ساتھ مل کر بھوک، افلاس، بیروزگاری کا رونا روئیں گے، لیکن یہ لوگ جب اسلام آباد کے ٹھنڈے ایوانوں تک پہنچتے ہیں تو پھر بے اختیار ان کے بیانات تبدیل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ جرنیل کو مدبر سیاستدان تک کہنے سے گریز نہیں کرتے۔

بڑے ایوانوں اورعہدوں تک رسائی رکھنے والے سیاستدان زبان اور بیان بازی میں یکتا مہارت رکھتے ہیں۔ یہی لوگ جب عوام سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ماضی میں فلاں صاحب اقتدار نے بلوچستان میں ترقی وخوشحالی کے دروازے بند رکھتے ہوئے اس وطن کو پسماندہ رکھا، اب ایسے ترقی دشمنوں کا سیاسی کردار ختم کر دیا گیا ہے، بلوچستان میں میگا پراجیکٹس کی تکمیل سے ترقی وخوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہوگا۔ لیکن دونوں اطراف پر کھڑے سیاستدانوں کا اگر موازنہ کیا جائے بلکہ محاسبہ کیا جائے تو رتی برابر بھی فرق نہیں ملے گا۔ ہر ایک اپنے مقاصد اور مفادات کے حصول کے لئے سرگرداں ہے۔

بلوچستان کی پسماندگی ومحرومی دونوں کے لئے ٹھنڈے ایوانوں تک پہنچنے کی کامیاب سیڑھی ہے جسے ختم کر کے اپنے پیر پر بھی کلہاڑی مارنے کے موڈ میں قطعاً نہیں۔ ''انسان کی عظمت'' کو بالا ایوانوں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے اور انہی بڑے عہدوں کی چھاؤں میں انہیں تلاش کرنا چاہئے کیونکہ ان سیاسی اور دردی پوش درختوں کے میوہ جات دیکھنے میں تو انتہائی خوب صورت ودلکش نظر آتے ہیں، ان دل کو بہلایا تو جا سکتا ہے لیکن انہیں کھایا نہیں جا سکتا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ''انسان کی عظمت'' میں بلوچستان کی سنگلاخ چٹانوں اور بیابانوں میں ٹھٹھرتی اور چلچلاتی دھوپ میں سینہ تانے مردانہ وار لڑتے ''گدانوں'' میں ملے گی جنہیں اپنی سرزمین بلوچستان سے اتنا پیار ہے جس کا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے لیکن ہم نے اپنی اناؤں کی نوراکشتی میں مادرِ وطن بلوچستان کے حقیقی فرزندوں کو نہ صرف نظر انداز کر دیا ہے بلکہ ان سے لاتعلق سے ہو گئے ہیں۔

اب وقت کا تقاضا ہے کہ ہمیں اپنی اناؤں کا گلا گھونٹنا ہوگا۔ یہ نوراکشتی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے اور دھکا دینے کی روایات دفنانا ہوں گی اور اپنے ان لوگوں کے پاس جانا ہوگا جہاں عظمت بھی ہے، محبت بھی ہے اور ہمت بھی ہے۔ گزشتہ 60 سالوں کی اس نوراکشتی میں ہم بہت کچھ گنوا چکے ہیں، اب مزید گنوانے کی سکت نہیں۔ ہمیں بہت کچھ بچانا ہے آنے والی نسلوں کے لئے۔ اپنے کل کے لئے جو ہمارا اپنا

ہوگا۔اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم اسلام آباد کے اعلانات اور ایوانوں کی ٹھنڈی ہواؤں کو چھوڑ کر بلوچستان کی سنگلاخ چٹانوں بیابانوں کا رخ کریں گے۔شاید اس سفر میں ہمیں اپنے اندر میں انسان کی عظمت کی قدرِ منزلت سے بھی آشنائی ہو جائے اور ہم انسان کو پالیں گے جسے اپنی سرزمین سے عشق ہے۔عشق جولامحدود ہے۔آؤ اپنے ہونے پر فخر کریں' کیونکہ ہمیں اپنی تہذیب ثقافت کی حفاظت کرنی ہے' جرات کے ساتھ تہذیبی آثار کو بچاتے ہوئے اپنی شاندار روایات کو آگے بڑھانا ہے۔اسے اپنے جسم وجان میں خون کی طرح گرماتے ہوئے موجزن نہ کیا اور اپنے ماضی اور قومی تشخص سے انکاری ہوئے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ ہم بلوچستان کو اس آشوب میں مبتلا کر رہے ہیں' محرومی ،محکومی پسماندگی ،لاشعوری جہاں اس کا مقدر ہوں گے اور مسلسل تضحیک کا یہ طرز عمل اسے وقار کی بلندیوں تک پہنچنے نہیں دے گا۔ہماری تہذیب وروایات کے تمام چشمے خشک ہوں گے، ہم ذہنی بانجھ پن میں مبتلا ہو جائیں گے، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔اس سے پہلے کہ اک اور قیامت ہم پر ٹوٹ پڑے اور تاریخ ہم پر ماتم کرے، آؤ اسے اپنے ہونے اور اپنی عظمت کی گواہی دلائیں۔عظیم مادرِ وطن کے گیت گائیں، اور تمام بھٹکے ہوئے ذہنوں کو ان ''گدانوں'' کی طرف لے آئیں جہاں انہیں زمین کے گیت گانے پر اکسائیں۔اپنی محبت ،عظمت اور جرات سے سورج کی روشنی کو دیکھنے کا جذبہ انتظار پیدا کریں جس کی روشنی کی آرزو بھی آج ہمارے لئے ممنوع ہے لیکن ہم آگے بڑھیں کیونکہ کل ہمارا ہے۔ہمیں جھومتے ہوئے آگے اور آگے بڑھنا ہوگا اور سورج کا استقبال کرنا ہوگا جس کی آرزو آج ہمارے لئے ممنوع ہے لیکن وہی سورج ہمارے روشن مستقبل کی نوید ہوگا۔

(18 اکتوبر، 2007ء)

جس نے بھید چھپایا، اُس نے مراد پائی

آسمانوں سے اترنے والی آخری مقدس کتاب کی ایک آیت کا ترجمہ ہے کہ ''جس نے اپنا بھید چھپایا اس نے مراد پائی۔'' اب آئیں اس بات پتہ لگائیں کہ آخر بھید کسے کہتے ہیں۔ ظاہری رائج معنی تو یہی ہے کہ آپ کے اندر میں ایک بات ہو اور وہ راز آپ کسی سے نہ کہیں جبکہ بظاہر آپ کا عمل اس کے برعکس ہو۔ مطلب کہ ایک انسان کے ظاہر و باطن میں، قول و فعل میں واضح فرق ہو۔ اب اگر اس پس منظر میں ہم اپنی سرزمین کے حالات دیکھیں گے تو بہت کچھ بغیر کسی وضاحت کے با آسانی سمجھ آجائے گا۔

ابھی کچھ روز قبل ایک بڑی مذہبی جماعت کے رہنما نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر بلوچستان کا دورہ کیا۔ ان کے دورہ کی تشہیر اور پروگرامات پر کتنے اخراجات ہوئے، یہ تو ان کے مخالفین نے سب کو بتا دیا ہے۔ مگر انہوں نے بلوچستان کے مسائل پر کھل کر باتیں کہیں اور کہا کہ پہاڑوں پر لڑنے والے بلوچوں سے گفت وشنید کی جائے۔ یہ سیاسی رویہ صرف مولانا صاحب کا نہیں ہے بلکہ بلوچستان کی سرحدوں میں جو بھی داخل ہوتا ہے، وہ بلوچوں کا ہمدرد بن جاتا ہے اور یہی حضرات جب پارلیمان یا اسلام آباد پہنچتے ہیں تو ان کے سامنے کئی اقتداری مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بلوچستان میں حالیہ جاری آپریشن کا جب آغاز ہوا تھا تو مولانا صاحب کی جماعت شریکِ اقتدار تھی۔

کوئٹہ شہر میں ابھی مولانا صاحب کے دورہ کے سائن بورڈ ہی نہ ہٹے تھے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ آپہنچے۔ انہوں نے بھی اپنے مختصر دورہ میں بلوچستان کے عوام سے معافی طلب کی اور کچھ امداد بھی اعلان کیا۔ ویسے بھی بلوچستان پر آج کل معافیوں کی مسلسل بارش ہو رہی ہے۔ اب ظاہر ہے ایک انسان جب کسی فوتگی والی جگہ پہنچے گا تو فاتحہ خوانی کر کے اظہارِ ہمدردی ہی کرے گا۔ ہم جو 'لواحقینِ بلوچستان' ہیں، ہمارے ہاں ایک عرصہ سے صفِ ماتم بچھی ہے۔ پھر روایتی طور پر یا اسلامی و اخلاقی اقدار کے تحت جو بھی

پہنچتا ہے وہ ہمدردی کے دو بول سنا ہی جاتا ہے۔ حالانکہ بلوچوں نے کبھی بھی کہیں بھی یہ احساس کسی کو نہیں ہونے دیا کہ وہ قابلِ رحم ہیں یا ہمدردی کے لائق ہیں۔ اس سے قبل بھی صاحب اقتدار حلقوں نے مختلف مواقع پر بلوچ قوم سے معافیاں مانگی ہیں لیکن بات معافیوں کی نہیں بلکہ زیادتیوں کے ازالوں کی ہے۔ ہم جس گھر میں موجود ہیں وہاں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیا موجود ہیں، ہمیں وسائل کی کمی بھی نہیں، ہم تو صرف اپنی ہی چیزوں پر حقِ ملکیت کے خواہشمند ہیں اور یہ کوئی ایسا عمل نہیں جسے پورا کرنے کیلئے ہمیں کسی سے اجازت کی ضرورت ہو۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر ہم جو گھر کے مالک ہیں، صرف اتنا کہہ رہے ہیں کہ ہم بن بلائے مہمانوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اس سرزمین پر وردی والے ہوں یا سادہ لباس میں ہوں، اب ہم اس قابل نہیں کہ مزید یہ بوجھ برداشت کر سکیں۔

بلوچستان کے تمام سیاسی مناظر کو اگر ہم دل کی آنکھ سے دیکھیں گے تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ بلوچ عوام نے کبھی بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ معافی صرف وہ طلب کریں جو شریکِ جرم رہے ہیں۔ اصل معافی تو انہیں مانگنی چاہئے جو ان تمام زیادتیوں کے براہِ راست حصہ دار رہے ہیں۔ مگر وہ تو اب بھی ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں کہ بلوچستان مسئلہ کا حل طاقت کا استعمال ہے، تو ایسے میں معافی مانگنے والی قوتوں کے اختیارات کا وہ مرہم بھی نہیں جو ہمارے زخموں کو کچھ دیر کیلئے سکوں دے سکے۔ تو پھر ہمیں دل کی آنکھ سے یہ نظر آ رہا ہے کہ ملک کی تمام سیاسی قیادت اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کا شوق پورا کرنے کی خاطر بلوچوں سے ہمدردی جتانے چلی آئی ہے۔ جس طرح بلوچوں کو ان کے بے اختیاری کا علم ہے بالکل اسی طرح وہ خود بھی اپنی بے بسی سے بخوبی واقف ہیں۔ مقتدر قوتوں کے دلوں میں ایک بھید ہے جو مخفی رکھنے کیلئے وہ دیگر حرکات جاری رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اپنا بھید چھپا کر اپنے دل کی مراد پالیں گے جبکہ اس سرزمین کے سادہ لوح عوام سے ان کا بھید مخفی ہے اور نہ ہی ان کی مراد اب کوئی راز ہے؛ کیونکہ یہ سلسلہ آج سے نہیں۔ اگر ہم تاریخ کی کڑی سے کڑی ملائیں گے تو ہمیں ایک مکمل زنجیر بنتی نظر آئے گی جس سے ہمارے جذبات، ہماری خواہشات انہوں نے باندھی ہوئی ہیں لیکن ان کی آنکھوں پر تو اقتدار کی مدہوشیاں ہیں۔ اس لئے انہیں یہ نہیں معلوم کہ خواہش اور جذبات تو خوشبو ہیں جو ذرا سی ہوا سے پھیل جاتے ہیں۔ بلوچستان کے باشندے جب بھی اپنی سرزمین کے دفاع اور اپنے وسائل پر حقِ ملکیت کی جنگ کا آغاز کرتے ہیں تو جھوٹی قسمیں جھوٹے وعدے کر کے مکر و فریب سے بابو نوروز بلوچ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی کا دِیا بجھا دیا جاتا

ہے۔اس کے بعد پھر جب شورش اُٹھتی ہے تو مذاکرات کے نام پر اکبر بگٹی کی مقید لاش کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ اب یہ جو معافیوں کا سلسلہ چل نکلا ہے تو اس نئی چال سے نہ جانے کتنے بلوچوں کی زندگی سے کھیلا جائے گا۔ اس لئے یہ وقت احتیاط اور سلیقے سے آگے بڑھنے کا ہے۔جس طرح ہمارے ساتھ لڑنے والوں اور معافی مانگنے والوں نے اپنے اپنے بھید چھپا رکھے ہیں ،ہمیں بھی اس حکمتِ عملی پر عمل کرتے ہوئے اپنی طویل جدو جہد کے بھید چھپانا ہوں گے،تا کہ ہم اپنی وہ مراد پاسکیں جس کے لئے ہم نے جانی قربانیاں دی ہیں، اپنے وسائل کی لوٹ مار برداشت کی ہے۔مگر یہ پختہ یقین ہے کہ ہم نے ان اندھیروں میں اپنے لہوں سے جو چراغ روشن کئے ہیں ان سے ایک ایسا اجالا اُٹھے گا جس سے وہ تمام مکروہ چہرے ظاہر ہو جائیں جو ہم سے کی گئی زیادتیوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہماری مراد کی یہی پہلی منزل ہے کہ اپنے دشمنوں کے بارے میں علم ہو لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ کون ہمارا دوست ہے۔

(17جولائی،2008ء)

تُو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا

ہم اس بحث میں کبھی نہیں الجھے کہ فن بڑا ہوتا ہے یا فنکار، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ جس طرح ہر انسان اچھا فنکار نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ہر فنکار اچھا انسان نہیں ہوتا۔ اب اچھائی و برائی کی ایسی فہرست بنائیں گے تو بہت طویل ہو جائے گی، اس لئے فی الحال ہم اپنے موضوع کو اس شخص تک محدود رکھتے ہیں جو اپنے فن میں بہت بڑی عظمتوں کا مالک ہے، اہمیت و مقبولیت کا چرچا تو پہلے بھی سب پہ بھاری ہے مگر اس روز جب سرکاری ٹی وی سے ان کے انتقال کی خبر نشر ہوئی تو ہزاروں نہیں، لاکھوں دلوں کی دھڑکنیں تھم گئیں اور جب عقیدتوں کے بند ٹوٹ کر آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگے تو مختلف چینلز سے اس خبر کی تردید آ رہی تھی۔

یوں تو عام قاری کیلئے احمد فراز کی وجہ شہرت ایک رومانوی شاعر کی ہے لیکن احمد فراز کو ترقی پسند، سوشلسٹ، جمہوریت پسند اس تعارف سے بھی جانتے ہیں کہ وہ کبھی درباری شاعر نہیں رہے۔ احمد فراز کے قلم نے ہر جابر و آمر کے سامنے کلمۂ حق لکھا جس کی پاداش میں فراز کو سہولیات و مراعات کی محرومی کے علاوہ ذہنی و جسمانی اذیت کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر اس کے باوجود فراز نے لکھا کہ:

اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

ہر چڑھتے سورج کو سلام کرنے کے عادی، اندھیروں کو سویرا لکھتے رہے مگر فراز نے یہ گمراہی نہ پھیلائی جس کے نتیجے میں فراز کا حلقہ احباب محدود ہو گیا اور وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگے تو انہوں نے لکھا:

بے آواز گلی کوچوں میں غزل سرا ہے
شہرِ سخن کا ایک مسافر تنہا تنہا

تنہائی کی اس کیفیت کو انہوں نے کبھی بھی مایوسی والم کا شکار ہونے نہیں دیا کیونکہ ان کا تعلق جس قبیلے سے تھا وہ جانتے تھے کہ اس مورچے پر بیٹھے افراد مصائب کا سامنا نہیں کر پاتے، اس لئے اس قبیلے کے افراد کی اکثریت موقع پرست ہوتی ہے۔ وہ کسی تبدیلی کیلئے طویل جدوجہد کے بجائے بدلتی ہواؤں کا رخ دیکھ کر اپنے سفر کی سمت تبدیل کر لیتے ہیں۔ اسی لئے تو جب فراز نے اپنے الفاظ کے عذاب کو اکیلے بھگتا تو صاف صاف لکھ دیا کہ؛

مشکل وقت میں کون کس کا سہارا بنتا ہے فراز

سوکھے پتوں کو تو درخت بھی گرا دیتے ہیں

اب یہ فراز کی بڑائی ہے کہ انہوں نے خود کو خشک پتے کے مترادف لکھا ہے اور ساتھ چھوڑ جانے والے موقع پرستوں کو وہ درخت سمجھتا ہے جبکہ حقائق اس کے برعکس ہیں، لیکن فراز نے اپنی پوری شاعری میں کبھی بھی بددعا نہیں لکھی؛ جس غزل سے مہدی حسن نے شہرت کی عظمت کو چھو لیا تھا اس میں بھی فراز اپنے ناراض محبوب کو بددعا دینے یا کوسنے کے بجائے ایک صابر چاہنے والے کی طرح مہذب انداز میں محض درخواست کر رہے ہیں کہ؛

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کیلئے آ

آ، پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کیلئے آ

جن لوگوں نے فراز کے ساتھ بہاریں گزاریں، چمن پر جب خزاں آئی تو وہ ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے لوگوں کو بھی فراز نے کبھی برا نہیں کہا بلکہ اپنے دل کی اس رحمدلانہ عادت کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بس ہو کر لکھا کہ؛

رسم محبت اجازت نہیں دیتی فراز

ورنہ ہم بھی تجھے ایسا بھولیں کہ سدا یاد رکھو

وہ اپنی اس خواہش پر عمل تو نہیں کر سکے مگر اس کے باوجود وہ اپنے مخالفین کو سدا یاد ہیں، حالانکہ شہرت انسان کے ہم عصروں کو حاسد بنا دیتی ہے۔ ویسے شہرت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشہور ہونے والا مغرور ہو جاتا ہے مگر فراز کے قریب رہنے والے سبھی جانتے ہیں کہ وہ اس بیماری کا شکار کبھی نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ محفل کی جان رہے' اُن کے اندازِ گفتگو میں مزاح اور سادگی سب کو بھاتی تھی۔ آج جب وہ بیرونِ ملک کے ایک ہسپتال میں زندگی و موت کی جنگ لڑ رہے ہیں تو پوری دنیا میں ان کے چاہنے والے

اپنی سانسیں ان کے نام کرنے کو تیار ہیں، مگر اس شخص نے تو بہت پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ؛

زندگی تو اپنے قدموں پہ چلتی ہے فراز

دوسروں کے سہارے تو جنازے اٹھائے جاتے ہیں

فراز کا یہ شعر اپنے چاہنے والوں کی دل آزاری یا بے قدری نہیں بلکہ وہ تو خودداری اور خود اعتمادی کے ایسے قائل ہیں کہ اپنا ہر درد اپنی ملکیت تصور کرتے ہیں اور ساری اذیتوں کو اپنے اندر سما کر دنیا کی خوشیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ پھر جب اس بھیڑ میں کوئی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت کا اظہار کرتا ہے تو فراز بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں کہ؛

کچھ تُو ہی میرے درد کا مفہوم سمجھ لے

یہ ہنستا ہوا چہرہ تو زمانے کیلئے ہے

اپنے چاہنے والوں کو دوستی اور اخلاص کا درس دینے والا فراز آج دعاؤں کا طلب گار ہے۔ آج چاہنے والوں کی تمام چاہتوں کو دعاؤں میں بدلنے کا وقت ہے کیونکہ فراز نے تو ہمیشہ اپنے اور چاہنے والوں کے درمیان ایک فاصلہ رکھا ہے۔ وہ درباری شاعر ہے نہ عام مشاعراتی شاعر، اس کا اپنا ایک مخصوص حلقہ ہے جس سے الگ ہو کر اب فراز بہت اکیلا ہو گیا ہے۔ اس لئے اب فراز کے چاہنے والوں پر لازم ہے کہ وہ تمام حصار توڑ کر ذہنی طور، جسمانی طور، روحانی طور غرض کہ فنی طور پر فراز کے قریب جا کر اپنی عقیدتوں کے سجدے کر کے ان کی سانسوں کو دوام بخشیں کیونکہ فراز نے تو خود اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہا تھا؛

تو خدا ہے نہ میرا عشق فرشتوں جیسا

دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

اس لئے فراز اور ہماری محبتوں میں حائل تمام رکاوٹوں کو ہٹا کر ہمیں ہمت و حوصلوں کے ایسے تحفے اُن تک پہنچانے ہیں جس سے فراز کی حیات کے دیے پھر سے جل اٹھیں اور اس کی لو سے ایسا اجالا ہو کہ ہماری نسلیں آمروں کی درباری و خوشامدی ہونے کے بجائے ثابت قدمی سے سویروں کا سفر کریں۔

(20 جولائی، 2008ء)

میرٹ؛ زمین وآسمان کوملانے کی خواہش

دنیا کی نام نہاد سپر پاور امریکہ میں ایک عرصے سے صدارتی انتخابات کی تیاریاں جاری ہیں اور اب تک صرف یہ ہوسکا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں نے اپنے نامزد امیدواروں سے متعلق عوامی رائے کا مرحلہ مکمل کرلیا ہے جبکہ اس کے برعکس ہمارے ہاں امیدوار عوام پر مسلط کئے جاتے ہیں اور کسی بھی جماعت میں ان کی نامزدگی کی بنیاد کوئی قابلیت وصلاحیت نہیں بلکہ اس کی سماجی حیثیت وخاندانی وراثت ہوتی ہے۔ اسی طرح سرکاری محکموں میں ملازمت کا حصول امیدوار کی ڈگری نہیں بلکہ مالی حیثیت وسماجی تعلقات کی بنیاد پر ہوتا ہے، حاضر سروس ملازمین کی ترقی بھی اس کی کارکردگی کے بجائے سفارش وخوشامد یا رشوت کے عوض ہوتی ہے، اور یہ سب تب ہوتا ہے جب قوموں کی پہلی ترجیح تعلیم نہیں ہوتی۔

یوں تو اگر ہم تعلیم کے میدان میں اپنی سرزمین کا جائزہ لیں تو رونگھٹے کھڑے ہوجائیں گے لیکن فی الحال ہم موجودہ صورتحال میں ان طلبہ پر نظر ڈالتے ہیں جو اپنے مطالبات کے حق میں تادمِ مرگ بھوک ہڑتال پر بیٹھے ہیں۔ یہ بلوچستان کی آئی ٹی یونیورسٹی کے طالبعلم ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ صوبہ کی واحد آئی ٹی یونیورسٹی میں میرٹ کے بجائے داخلہ پالیسی میں ضلعی کوٹہ سسٹم کا نفاذ کیا جائے۔ اس موقف کی حمایت صرف بلوچ طلبہ کررہے ہیں جبکہ پشتون طلبہ نے ان کی مخالفت میں مظاہرے کرکے اپنا الگ اظہار کردیا ہے۔ پشتون طلبہ کا کہنا ہے کہ آئی ٹی یونیورسٹی میں میرٹ کی بنیاد پر ہی داخلے دیے جائیں۔

یقیناً ہر تعلیم یافتہ وذی شعور انسان تعلیم وملازمتوں سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں میں میرٹ کے نفاذ کی حمایت کرے گا، مگر ہمیں بلوچستان کے زمینی حقائق بھی سمجھنا ہوں گے۔ جس طرح ہم وفاق سے این ایف سی ایوارڈ کی بنیاد محض آبادی کو مسترد کرتے ہیں بالکل اسی طرح ہمیں اپنے اداروں یا بنیادی حقوق کے حصول میں صرف میرٹ کی رِٹ رَد کرکے صوبہ کے حالات کے پیش نظر کچھ تلخ فیصلے کرنا ہوں گے۔

انسانوں کے بنیادی حقوق مختلف اشیا و مراعات کے حصول میں بھی میرٹ کی بنیاد تب رکھی جاتی ہے جب تقسیم کے عمل میں مکمل شفافیت کا یقین ہو۔ تعلیم کے معاملے میں تو یہ حقیقت ہے کہ بلوچستان انتہائی پسماندہ ہے۔ ہمارے صوبہ کا ایک ہی مرکزی شہر کوئٹہ ہے جہاں زندگی کی تمام سہولیات و مواقع میسر ہیں، اور یہ ایک کڑی حقیقت ہے کہ بلوچستان کے اس مرکزی شہر کی سہولیات و مواقع پر بلوچ عوام کی رسائی ممکن نہیں۔ بلوچ طلبہ کی اکثریت ان اسکولوں میں زیر تعلیم ہے جہاں آج بھی معصوم بچے درخت کے سائے تلے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور وہاں تعینات اساتذہ آج بھی گاؤں کے سردار کی منشی گیری کرتے ہیں۔ اپنے حالات و غربت کے باعث اکثر طالب علم مڈل یا میٹرک سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ کچھ والدین اپنے پیٹ پر پتھر رکھ کر بڑی مشکل سے اپنے بچوں کو انٹرمیڈیٹ کرواتے ہیں اور پھر اعلیٰ تعلیم کے شوق میں کیچ، پسنی، کوہلو، ڈیرہ مراد، صحبت پور، سنجاوی، بیل پٹ کا بچہ جب کوئٹہ پہنچتا ہے تو اس کا مقابلہ کوئٹہ کے پرائیویٹ اسکولوں کے ان بچوں سے ہوتا ہے جو پرائمری سے انگلش پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہے کہ ایک مقرر منزل تک پہنچنے کیلئے ایک شخص کو کار میں بٹھایا جائے اور اس کے مقابلے میں دوسرے کو پیدل بھاگنے کو کہا جائے تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں میرٹ کی یہی پوزیشن ہے۔ اس لئے جب تک صوبہ بھر کے تمام اضلاع و دیہات تک یکساں تعلیمی سہولیات مہیا نہ ہوجائیں، تب تک میرٹ کی بات زمین آسمان کو ایک کرنے کے مترادف ہے۔

اب ایک طرف بلوچ طلبہ ضلعی کوٹہ کی بحالی چاہتے ہیں تو دوسری جانب پشتون طالبعلم میرٹ کی بات کررہے ہیں لیکن یہ مسئلہ کسی بھی صورت میں لسانی نہیں کیونکہ تمام پشتون بھی شہروں میں آباد نہیں اس لئے میرٹ کا فائدہ صرف ان چند طلبہ کو ہوگا جو بڑے شہروں کے معیاری اداروں سے فارغ التحصیل ہیں۔ کچھ سیاسی جماعتیں اس مسئلے پر اپنی دوکانداری کرنا چاہتی ہیں اور وہ ایک عام تعلیمی مسئلے کو لسانی رنگ دیکر صوبے کی دائمی، بلوچ پشتون آبادی کو ایک دوسرے کے مخالف کرنا چاہتی ہیں۔ اب نہ صرف احتجاج کرنے والے طلبہ بلکہ بلوچ و پشتون سنجیدہ سیاسی قیادت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نادیدہ قوتوں کی سازش کو ناکام بنائیں اور کوئی ایسا حل نکالیں جو لسانی تفریق سے ہٹ کر بلوچستان کے تمام طالبعلموں کے لئے قابلِ قبول ہو۔

سیاسی تاریخ میں اپنے حقوق کی جدوجہد مختلف مراحل طے کرتی ہے، جن میں انتہائی قدم تادمِ مرگ بھوک ہڑتال بھی ہے۔ مگر درست تربیت اور رہنمائی نہ ہونے کے باعث ہمارے طلبہ نے اپنی

جدوجہد کا آغاز ہی انتہائی قدم سے کیا ہے، تو اب دیگر مراحل کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ احتجاج پر جانے والے دوستوں کو احساس ہونا چاہئے کہ کچھ مسائل فوری حل طلب ہوتے ہیں جبکہ کچھ مسائل کے لئے قانونی وفنی رکاوٹیں ہوتی ہیں جن میں ایک وقت چاہئے ہوتا ہے۔ اس لئے ہماری بلوچ سیاسی قیادت پر یہ بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ قوم کے ان ہونہاروں کے سروں پر دستِ شفقت رکھا جائے اور ان کی رہنمائی کر کے ان کی جدوجہد کو درست سمت دی جائے اور ان نوجوانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ قوم کیلئے اُن کی زندگی کی بہت اہمیت ہے۔

(22جولائی،2008ء)

اصل جنگ سے گمراہ کرنے کی سازش

تاریخ میں تو کوئٹہ کی شناخت شالکوٹ سے ہے، جیسے کراچی کا نام کلاچی کی بگاڑ ہے۔ کراچی اور کوئٹہ میں کئی چیزیں مشترک ہیں؛ جیسے کراچی سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے تو اسی طرح بلوچستان میں یہ اعزاز کوئٹہ کو حاصل ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ دونوں بڑے شہر لاکھوں افراد کیلئے مرکز روزگار ہیں۔ اس لئے مختلف گروہوں نے روزگار کے وسائل پر قبضہ کرنے کی نیت سے سیاسی مذہبی ولسانی بنیادو پر غیر مقامی افراد کو ان شہروں میں آباد کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مقامی آبادی کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ان دونوں شہروں کے اصل وارث گمنام کردار بن گئے۔

جب اس ملک کی بنیاد مذہب کے نام پر رکھی گئی تو بھارت میں مقیم مسلمانوں سے بھری ٹرینیں لاہور پہنچیں تو بڑے بھائیوں نے کہا کہ 'پاکستان ابھی آگے ہے' سندھ کو کفر کی سرزمین جان کر محمد بن قاسم نے فتح کرکے باب الاسلام قرار دیا تھا حالانکہ محمد بن قاسم سے بہت پہلے کئی اولیا و پیغمبروں کا مرکز رہنے کی وجہ سے سندھ کو ہمیشہ صوفیائے کرام کی سرزمین کہا جاتا رہا ہے۔ بہرحال پھر پاکستان کے حق میں پہلی قرارداد بھی سندھ اسمبلی سے منظور ہوئی جس کا صلہ سندھ کو یہ ملا کہ کراچی دنیا بھر کے مسلمانوں کا یتیم خانہ بن گیا۔ اگر بھارت سے آنے والوں تک بات محدود ہوتی تو بھی ٹھیک تھا مگر پھر افغانی، بنگالی، برمی سب نے یہاں کا رخ کیا اور کراچی کے اردگرد اپنی کالونیاں آباد کرکے روزگار کے وسائل پر اس طرح قابض ہوگئے کہ کراچی کے اصل وارث اجنبی بن گئے۔ مختلف لسانی گروہوں نے کراچی میں ایسا بیج بویا جو آج نفرت بھرا درخت بن چکا ہے۔ اب کراچی کے وسائل روزگار اور زمین کے حقِ حاکمیت کے فیصلے باہر ہوتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس گھر کے وسائل تقسیم کررہے ہیں، جہاں یہ دونوں خود مہمان ہیں۔ یہ حیرت ہے کہ دونوں مہمانوں نے کبھی کسی فیصلہ میں اپنے میزبان کو شریک نہیں کیا جو دنیا کے ہر قانون میں اس سرزمین کا وارث ہے۔

کراچی کے مختصر تعارف کے بعد اب دل کی آنکھ سے ہم کوئٹہ کا نظارہ کرتے ہیں۔ کوئٹہ جہاں کا

دلفریب موسم غیروں کو بھی اپنا بنالیتا ہے، یہاں بہت پہلے ہماری تعلیم، دفتری کام اور قانون سنبھالنے کیلئے بڑوں کے مشورے پر بڑے بھائیوں کو تعینات کیا گیا۔ یوں ان محکموں میں تو ہمیشہ نسل در نسل غیر ہی آباد رہے۔ پھر افغان جنگ کے دوران مذہب کے نام پر مہاجرین کی یلغار نے کوئٹہ کو گھیر لیا اور اس طرح تعلیمی اداروں سمیت صحت، تعلیم، زراعت، آب پاشی، بلدیہ جیسے محکموں پر قبضہ ہونے لگا۔ نہ صرف یہ بلکہ نجی کاروبار، ہوٹلز، شاپنگ سینٹر، ٹرانسپورٹ پر بھی مخصوص لسانی گروہ چھا گیا اور بلوچستان کے دارالحکومت میں بڑے سلیقے اور گہری سازش سے بلوچوں کو روزگار کے تمام وسیلوں سے محروم کر دیا گیا۔ اب پورے کوئٹہ میں بلوچ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا جبکہ ہر شاہراہ، ہر محلے، ہر گلی میں غیر بلوچوں کی کثیر تعداد بغیر کسی تلاش کے آپ کو مل جائے گی۔ بلوچوں نے اپنے تاریخی مزاج کے تحت ایسی ہر آفت کو رحمت سمجھ کر قبول کیا اور اپنے دل کی طرح اپنے دستر خوانوں اور گھر کے صحن کو وسیع کرتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخری نوالہ تک یہ مہمان ہڑپ کر گئے اور اب ہمارے بزرگ خالی دیگچی چولہے پر رکھ کر اپنے بچوں کو بہلا رہے ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے کی شکایت تو گھر کے بچوں نے کبھی نہ کی لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ ایک عرصہ سے اس سرزمین کے وسائل پر پلنے والے مختلف لسانی گروہوں نے مل کر یہ سازش تیار کی ہے کہ کوئٹہ سے بلوچوں کو بے دخل کیا جائے۔ اس لئے مختلف بنیادوں پر ہونے والی معمولی باتوں کو ہوا دیکر ایک جھگڑے کی شکل دی جاری ہے۔ اس سازشی منصوبے کی تقسیم میں بلوچوں کو صرف سریاب کے علاقے تک محدود کیا جا رہا ہے، یعنی اب یہ فیصلہ بھی مہمان کریں گے کہ گھر کا مالک گھر کے کس حصے میں حرکت کر سکتا ہے۔

بلوچستان میں ایک عرصے سے غیر تحریری معاہدے کے تحت بلوچ وزیراعلیٰ اور پشتون گورنر مقرر ہوتا آیا ہے۔ اب کی بار دونوں اعلیٰ عہدوں پر بلوچوں کی تعیناتی ایک مخصوص لسانی سیاسی گروہ سے ہضم نہیں ہو رہی۔ اس لئے فرق کی لکیر کو شدت دی جا رہی ہے۔ ایسی صورتحال میں اس سرزمین کے اپنے اصل وارثوں کو تحفظ کی خاطر یکجا ہونا ہوگا لیکن اس اتحاد کا مقصد کسی کے خلاف سازش کرنا یا کسی کو بیدخل کرنا نہیں ہوگا بلکہ دھرتی کے وارثوں کا اتحاد مثبت انداز میں اپنا حقِ ملکیت بھی تسلیم کروائے گا اور یہاں موجود تمام لسانی گروہوں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا حق بھی ادا کیا جائے گا۔ اب بلوچ قیادت پر یہ لازم ہے کہ وہ انتہائی بردباری سے ہر سازش ناکام بنائے کیونکہ اس وقت بلوچستان میں مقیم گروہوں سے الجھنے کے بجائے اپنی پوری توجہ اصل جدوجہد پر مرکوز کرنی ہوگی۔ نادیدہ قوتوں کی یہی خواہش ہے کہ بلوچ اپنے رستے سے گمراہ ہو جائیں اور کسی اور جنگ میں مشغول ہو جائیں جہاں ان کی ساری توانائی ضایع ہو جائے لیکن بلوچ قیادت کو اس نازک وقت میں اپنی اصل جنگ سے دستبردار ہونے کے بجائے ہمت و حوصلے سے کام لینا ہوگا۔

(27 جولائی، 2008ء)

تعلیم کی تازگی، تبدیلی کی نوید

دنیا میں کسی بھی قوم کی ترقی کا موثر ترین ذریعہ، تعلیم ہے۔ تعلیم انسان کی وہ تیسری آنکھ ہے جس سے بظاہر نظر نہ آنے والے مناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں، اس لئے ایک ایسی قوم جس کا وجود مٹانے کیلئے اَن دیکھی سازشوں کا جال بچھا ہو، اس کے ہر فرد پر تعلیم کا حصول ایک قومی فرض ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہم قومی فرض نبھاتے ہیں یا پھر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے قومی رویوں میں جیسے یہ دو الگ الگ چیزیں ہوں۔ اس لئے ہمارے ہاں تعلیم قومی فرائض سے اور قومی فرض، تعلیم سے ہمیشہ نالاں نظر آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ہماری تعلیمی پسماندگی اس مقام پر نہ پہنچتی کہ محکمہ تعلیم کے صوبائی وزیر بھی اپنی ناکامی اور بے اختیاری کا اعتراف کرتے۔

جی ہاں، یہ کوئی افواہ یا اخباری اعداد شمار نہیں بلکہ ہمارے وزیر موصوف نے پریس کانفرنس کر کے بتایا ہے کہ بلوچستان میں ڈھائی ہزار اسکول اور ساڑھے تین ہزار گھوسٹ اساتذہ ہیں۔ کوئٹہ پریس کلب میں انہوں نے یہ تو نہیں بتایا کہ ان اسکولوں کی عمارت کو کس کس نے اپنے اناج کا گودام اور جانوروں کا اصطبل بنایا ہوا ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ گھوسٹ اساتذہ کس کس بنگلے کی منشی گیری کر رہے ہیں، لیکن انہوں نے تفصیلات بتاتے ہوئے یہ ضرور بتایا کہ بلوچستان میں اس وقت 12 ہزار کے قریب تعلیمی ادارے موجود ہیں جن میں سے پرائمری اسکولوں کی تعداد 10314، مڈل اسکول 862، ہائی اسکولز 583، انٹر میڈیٹ کالجز 53، ڈگری کالجز 30، فنی ادارے 4 جبکہ اساتذہ کی تربیت کے 12 ادارے موجود ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کالجز میں 42 ہزار طلبہ کیلئے صرف 12 سو اساتذہ موجود ہیں۔ اس کمی کو ختم کرنے کیلئے 5000 پروفیسرز اور لیکچرار کی ضرورت ہے۔ وزیر موصوف کے مطابق 15 سو اساتذہ کو نوکریاں دی جائیں گی۔ وزیر تعلیم نے ژوب، خضدار، تربت اور نصیر آباد میں نئے ڈائریکٹریٹس قائم کرنے

کا بھی اعلان کیا ہے۔

اگر ان ڈائریکٹریٹ کا مقصد تعلیمی بورڈز کا قیام ہے تو یہ خوش آئندہ ہے کیونکہ اب صوبہ بھر میں واحد بورڈ ہونے کے باعث تمام امتحانات کے نتائج انتہائی سخت اور مایوس کن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف نقل کے رجحان کو فروغ ملتا ہے بلکہ قابل طلبہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نئے بورڈز کی تشکیل سے صوبہ بھر میں مقابلے کے رجحان میں اضافہ ہوگا۔

محکمہ تعلیم کے وزیر کے مطابق ماضی کی حکومت نے بجٹ میں تعلیم کیلئے 14 فیصد مختص کیا جس میں سے 2 فیصد خرچ کر کے باقی رقم ہڑپ کی گئی۔ بلوچستان میں آج بھی 14 سو کے قریب ایسے تعلیمی ادارے موجود ہیں جہاں عمارت میسر نہیں۔ ان تمام حقائق کے اظہار کے بعد وزیر تعلیم نے جو بات کی ہے اسے تقویت ملنی چاہیئے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ وزیر اعلیٰ نے تمام اراکین اسمبلی کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ اپنے صوابدیدی فنڈ سے 50 لاکھ روپے تعلیم کیلئے مختص کریں اور وفاق سے بھی جتنی گرانٹ ملے گی، اس میں تعلیم کو اولیت دی جائے گی۔ کاش کہ یہ حقیقت ہو اور ہم اپنی ترجیحات میں تعلیم کو اولیت پر رکھیں تو بنیادی بہتری کیلئے پانچ سال کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی ان ترجیحات پر عمل کر کے جب یہ حکومت رخصت ہو رہی ہوگی تو ان کے ہاتھوں میں اپنی کارکردگی کی وہ رپورٹ ہوگی جس کی بنا پر عوام انہیں مزید مدت کیلئے منتخب کر سکتی ہے۔

کسی بھی منصوبے پر عمل کرنے کیلئے ایک حقیقت اختیارات و بے اختیارات کی بھی ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ جنگ ہماری ترجیحات طے کرنی کی بھی ہے۔ ہمارے سیاسی رہنماؤں کے سامنے اپنی شہرت کا سوال ہوتا ہے تو منتخب نمائندگان کے پاس اپنے بینک بیلنس میں اضافے کا مقصد ہوتا ہے۔ ان کی اپنی اولاد تو صوبہ اور ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی ہے مگر سرکاری اسکولوں کے آسرے پر کئی نسلیں تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ تعلیم ہماری ترجیحات میں شامل نہیں۔ رواں دہائی میں جس طرح بلوچ قوم نے یہ محسوس کیا۔ یہ ان کی سرزمین اور وسائل کی حفاظت میں سرکاری ادارے مخلص نہیں تو انہوں نے یہ کام اپنے ہاتھوں لے لیا، بالکل اسی طرح تعلیم اور تعلیمی اداروں کو قومی ورثہ سمجھتے ہوئے ہمیں حکومت کی ذمہ داری سے ہاتھ دھونا ہوگا اور اپنے طور پر فیصلہ کر کے تمام تعلیمی اداروں کے انتظامات سنبھالنے ہوں گے۔ ہمیں بند اسکولوں کو فنکشنل کرنے کیلئے نہ صرف حکومت پر دباؤ ڈالنا ہوگا بلکہ گھوسٹ اساتذہ کے خاتمے کیلئے اساتذہ یونین کو پابند کیا جائے کہ وہ ان اساتذہ کی ڈیوٹی کو یقینی بنائیں۔ علاقائی سطح پر تعلیم کی اہمیت کو اس

طرح اجاگر کیا جائے کہ اپنے بچے اسکول نہ بھیجنے والے والدین کو حقارت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اگر ہم نے اس طرح جنگی بنیادوں پر شعبہ تعلیم میں بہتری کی ٹھان لی تو آئندہ وزیر تعلیم بند پڑے اسکولوں کی تعداد بتانے کی بجائے معاشرے کو یہ بتائے گا کہ دور دراز علاقوں میں اساتذہ میسر ہونے کے باعث وہاں کے قومی کارکنوں نے بچوں کی تعلیم پر توجہ دے کر اپنا فرض نبھایا۔ جس روز ہم نے یہ سمجھ لیا کہ قومی سیاست صرف زندہ باد اور مردہ باد کے نعروں کے نام نہیں بلکہ اپنی آنیوالی نسلوں کو جہالت سے بچا لینا بھی سیاست ہے، قومی خدمت ہے، تو یقین کریں کہ ترقی کا سفر طے کرنے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔

(2 اگست، 2008ء)

میری زندگی ایک گیت ہے

اس ریاست نے جب تمام قوموں سے کیے گئے وعدوں کی انحرافی کی تو پورے ملک میں قلیل تعداد میں ہی سہی لیکن ایسی مخلوق موجود ضرور تھی جنہوں نے مذہب کی بنیاد پر آزادی کے دعویداروں کو یہ احساس دلایا کہ اس ملک کی سرحدوں میں مقید تمام قومیں اپنے تاریخی ورثے، تہذیب، ثقافت اور جغرافیائی حدود سمیت اس کرہ ارض پر پہلے سے موجود ہیں اور اس ریاست سے سب کا الحاق رضاکارانہ ہے۔ اس احساس کو جگانے کی پاداش میں ملک بھر کے 'سرخوں' کے خلاف ریاست کی ایسی بے آواز لاٹھی چلی کہ معاشرے میں ایک کمیونسٹ کا تعارف، کفر کہنے کے برابر ہو گیا۔

ایسے انتہا پسند معاشرے میں کالعدم پارٹی کے جو دو چار رہنما اپنے عمل و کردار سے عوام تک پہنچے، ان میں ایک نام شہید نذیر عباسی کا ہے جنہوں نے سندھ کے شہر ٹنڈو الہیار سے ٹریڈ یونین سیاست سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ ریل گاڑیوں میں چنے فروشی کر کے اپنی تعلیم جاری رکھتے تھے۔ جب ملک میں مارشل لاء کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے اور کمیونسٹ ہونا ریاست سے ٹکر لینے کے مترادف تھا، تب نذیر عباسی نے اپنا تعلق سرخوں سے جوڑا۔ یہ تعلق ایسا مضبوط تھا کہ آمروں کی اذیتیں بھی نذیر کو اپنے نظریے سے جدا نہ کر سکیں۔ نذیر عباسی نے مختلف فرضی ناموں سے ایسی سرگرم زندگی گزاری کہ بیک وقت وہ ٹریڈ یونین رہنما، کسان رہنما، طالبعلم رہنما تھے۔ انہوں نے زمانہ طالبعلمی کے دوران اپنی پارٹی کی رکن حمیدہ گھانگرہ سے بیاہ کیا تو ان کی تقریبِ نکاح بھی پارٹی کا ایک جلسہ تھا۔ اُن کی شریکِ حیات ایسی ہم قدم ثابت ہوئیں کہ کسی بھی کٹھن دور میں ان دونوں کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ کہیں بھی ظلم و زیادتی کا ذکر ہوتا تو متاثرین سے ہم آواز ہونے کیلئے یہ جوڑا پہنچ جاتا۔ ایسی کئی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ بلوچستان کے دور دراز علاقہ میں جب پٹ فیڈر کسان تحریک کا آغاز ہوا تو تب بھی نذید عباسی اپنی ہمسفر کے ساتھ وہاں موجود تھے۔

نذیر عباسی پر جب پارٹی نے ذمہ داری لگائی کہ طلبہ تنظیم کو منظم کیا جائے تو انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے ایسا کام کر دکھایا کہ ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن ملک کی واحد طلبہ تنظیم تھی جو طلبہ کے عالمی اتحاد کی رکن تھی۔ ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے نام نہاد لیڈر خوفزدہ تھے۔ کئی مرتبہ نذیر کی ہتک کی گئی، ان کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں مگر آج وہ سب نذیر کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کی حیثیت تک پہنچنے کو ترستے ہیں۔

طبقاتی نظام کے خلاف برسر پیکار نذیر عباسی نے شب و روز محنت کر کے اپنی تحریک کو عروج بخشا۔ جس سے اقتدار کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ خفیہ ایجنسیوں کا چین کھو گیا اور 'سب ٹھیک ہے' کہنے والے تنخواہ داروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ جسمانی طور پر کمزور دکھائی دینے والے نذیر عباسی نے عددی اعتبار سے مختصر تحریک میں ایسی جان ڈالی کہ نذیر کے سیاسی دشمنوں میں اضافہ ہو گیا اور مختلف روپ لئے کئی افراد ان کے راستے کی دیوار بن گئے۔ مگر نذیر کے حوصلے تو ہمالیہ سے بھی بلند تھے، اس لئے نذیر نے سب دیواریں، سب رکاوٹیں ہٹا کر اپنے پورے قافلے کو منزل کی جانب گامزن کیا۔ لیکن سچ کے سوداگروں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جھوٹ کے پجاری پشت پر وار کرنے کے عادی ہیں۔ نذیر کا قافلہ رواں دواں تھا۔ بہت سارے ساتھی زیرِ زمین ہو چکے تھے۔ پوری پارٹی کا بوجھ نذیر کے ناتواں کندھوں پر تھا کہ ایک روز ایسی مخبری ہوئی کہ نذیر گرفتاری سے نہ بچ سکے۔ پھر پورے دس روز تک نذیر پر ذہنی و جسمانی تشدد ہوتا رہا اور ان پر اپنے سب کمالات آزمائے گئے اور ان سے دیگر ساتھیوں کے بارے میں دریافت کرتے رہے مگر نذیر نے نہ صرف اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا بلکہ تمام مراعات اور سہولیات کی ہر پیشکش کو ٹھکرا کر کہا: ''ہماری آواز کو دبایا نہیں جا سکتا، موت سے ہمیں ڈرایا نہیں جا سکتا۔''

نذیر کو کئی راتیں سونے نہ دیا گیا، ان کو برف کی سیلوں پر لٹایا گیا، ان کی انگلیوں کے ناخن نوچے گئے پھر بھی آمروں کی خواہش پوری نہ ہوئی تو 9 اگست کو نذیر کی سانسوں کی ڈوری توڑ کر ان کے جسم کو ہمیشہ کیلئے ٹھنڈا کیا گیا۔ نذیر نے اپنی ٹوٹتی سانسوں میں بھی کہا تھا کہ؛

میری زندگی ایک گیت ہے

میری موت جدوجہد کی پکار ہے

شہادت کا رتبہ پانے والے نذیر عباسی کی لاش جب لاوارث قرار دے کر ایدھی والے سخی حسن قبرستان میں دفن کر رہے تھے، تو کسی کے علم میں نہ تھا کہ یہ موت جدوجہد کی ایسی پکار بنے گی جس سے تاریخ

ہمیشہ لرزتی رہے گی۔ ملکی تاریخ کے بدترین ڈکٹیٹر جنرل ضیاالحق نے نذیر عباسی کو 9 اگست کو محنت کش طبقہ سے جدا کیا اور کچھ برس بعد 17 اگست کو خود ہواؤں کے حوالے ہوئے۔ آج غیر طبقاتی نظام کیلئے مصروف عمل سارے سیاسی کارکن نذیر کو سرخ سلام پیش کرتے ہیں جبکہ اُن پر اذیت کے ذمہ دار تاریخ کی شرمندگی سے کبھی بچ نہ پائیں گے۔

جمہوری حکومت کے بعد جب نذیر کی وارث پارٹی سیاست میں سرگرم ہوئی تو 9 اگست کو نذیر کی برسی منائی جاتی رہی مگر جب سے 'سرخے' مایوس و منتشر ہوئے ہیں، نذیر عباسی کی برسی کا اہتمام نہیں ہوسکا ہے، لیکن شہید کی شخصیت کسی تقریب کی محتاج نہیں، ان کا عمل وافکار اب بھی اس معاشرے کی رہنمائی کرسکتے ہیں۔ جب تک معاشرے میں اجرت اور عزت کا تعین محنت کی بنیاد کے بجائے معاشی حیثیت پر ہو تب تک اس طبقاتی تقسیم کے خلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت رہے گی۔ اس لئے آج شہید نذیر عباسی کو سرخ سلام پیش کرتے ہوئے ان کے نظریے کو مشعل راہ بنا کر طبقاتی تاریکیوں کے خلاف متحد و منظم ہونا ہوگا تاکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جہاں رنگ، نسل، مذہب کی تفریق کے بغیر ہم اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنا کردار ادا کریں۔

(7 اگست، 2008ء)

ہر فن مولا ہی بے فن ہوتا ہے

پچھلے زمانوں کی بات ہے جب پوری بستی میں ایک شخص ایسا ہوتا تھا جو تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے ایک منفرد اور اعلیٰ حیثیت پالیتا تھا۔ گاؤں کے بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتا تھا تو پورے علاقہ میں نکاح و جنازہ پڑھانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا اور اگر گاؤں میں کوئی چھٹی آجائے یا کسی کو چھٹی بھیجنی ہو تو یہ کام بھی وہی کرتا تھا۔ جب زمانہ ترقی کے منازل طے کرتا چلا تو ہر کام کیلئے الگ علم مخصوص ہوا اور لوگ اپنے اپنے کام میں مہارت حاصل کرنے لگے لیکن اس جدید دنیا میں پھر بھی ایسی مخلوق رہ گئی جو اپنے کام کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہر فن مولا رہ گئی، ایسی مخلوق کو صحافی کہتے ہیں؛ جو بیک وقت سماجیات، سیاسیات، جرائم، جنگ وجدل، معاشیات سمیت دیگر تمام امور پر نہ صرف رپورٹنگ کرتا ہے بلکہ اسے یہ خوش فہمی بھی ہوتی ہے کہ وہ ان تمام علوم پر دسترس بھی رکھتا ہے۔ میڈیا میں تمام کم ایسے ادارے ہیں جو ہر فیلڈ کیلئے الگ شخص مقرر کرتے ہیں اور موجودہ ملکی میڈیا میں اکثر صحافی ایسے ہیں جو بیروزگاری سے تنگ آکر اس کنویں میں کود پڑے ہیں کیونکہ اس فیلڈ میں روزگار کے حصول کیلئے کچھ زیادہ تگ ودو نہیں کرنا پڑتی۔ اب عام نوجوان کی تجزیاتی ومشاہداتی سطح سے ہم سب واقف ہیں اس لئے صحافت کی بنیاد کو اتنے برس بعد بھی کوئی مضبوطی نہیں مل سکی۔ یہ جو ہمیں چند گنے چنے اچھے صحافی نظر آتے ہیں، انہوں نے صحافت سے کچھ نہیں سیکھا بلکہ یہ کسی نہ کسی پلیٹ فارم پر ماضی میں سیاسی کارکن رہے ہیں اور یہی علم ہے جو آج انہیں کام آرہا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے صحافی ایک دوسرے سے خبروں کی دوڑ میں مطالعے سے بہت دُور چلے گئے ہیں اور آج کا صحافی صرف واقعاتی تبدیلیوں سے واقف ہے، اس لئے وہ اچھا رپورٹر تو ہے لیکن تجزیے وتبصرے کی صلاحیت سے وہ محروم ہو چکا ہے۔

میڈیا کے میدان میں اگر کوئی بھی شخص اخبار یا ٹی وی چینل کیلئے سرمایہ کاری کرتا ہے تو وہ سمجھتا

ہے کہ اخبار یا ٹی وی کا لائسنس ملنے سے پوری دنیا کا علم اس میں انڈیل دیا گیا ہے۔ اس لئے اکثر اخباری مالکان اخبار کے صفحہ اول سے آخر تک خود چھائے رہتے ہیں اور ٹی وی چینل کے مالکان پورا دن ہر پروگرام میں خود بیٹھے ہوتے ہیں۔ قارئین و ناظرین کو نا کردہ گناہوں کی سزا دی جاتی ہے اور اپنے علم کے دریا بہائے جاتے ہیں۔ اس بات کا حقیقی تجربہ اس وقت ہوا جب ہمارے کوئٹہ شفٹ ہونے کے بعد کسی محسن نے فون کر کے کہا کہ اسلام آباد سے ایک نیا ٹی وی چینل آ رہا ہے، اس کے مالکان کوئٹہ میں آفس کام کرنے کیلئے آئے ہوئے ہیں، تم ان سے ملاقات کرلو۔ میں نے سوچا کہ انٹرویو میں شرکت میں کیا حرج ہے۔ میں اگلے روز بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا۔ رسمی تعارف ہوا۔ میں نے اپنے کوائف پیش کئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں کراچی کے ایک ٹی وی چینل پر کرنٹ افیئر ز ڈیپارٹمنٹ میں پروگرام ڈائریکٹر رہ چکا ہوں تو اخلاقی طور پر ان کے رویے، سلوک اور اندازِ گفتگو میں فرق آ جانا چاہئے تھا، مگر وہ پہلے کی طرح ہی غیر ضروری طور پر سنجیدہ رہے۔ پھر ایک انٹرویو کیا اور بولے کہ ہم یہاں باقاعدہ اسٹوڈیو قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں سیاسی پروگرام ہوں گے اس لئے ہمیں میزبان چاہئے جو یہاں کے معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ میں نے کہا جناب یہاں کا مقامی ہونے کی وجہ سے ہم سیاسی جماعتوں، رہنماؤں اور سیاسی مسائل سے مکمل باخبر ہیں۔ تو وہ بولے اچھا آپ میرا انٹرویو کریں، مجھے کسی بھی جماعت کا نمائندہ بنا کر سوال کریں اور اگر آپ نے مجھے مشکل سوالوں سے خاموش کرا دیا تو آپ کی نوکری پکی۔ ایسی مشروط نوکری مجھے اچھی نہ لگی۔ پھر بھی اس حکم کو اپنے انٹرویو کا حصہ سمجھتے ہوئے میں نے انہیں حکمران جماعت کا نمائندہ بنا کر سوال کئے، لیکن ہر جواب میں ''میں نا مانوں'' کی ضد تھی، اور وہ مالک تھا جبکہ میں نوکری کا امیدوار۔ ایک موقع پر جب صدر کے اختیارات کی بات نکلی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ 58 ٹو بی کیا ہے؟ میرے جواب کے باوجود وہ 'میں نا مانوں' کی ضد پر قائم تھے۔ پھر انہوں نے مجھ سے 1973ء کے آئین سے متعلق سوالات پوچھے۔ میں نے کہا جناب آپ نے مجھے اٹارنی جنرل بنانا ہے کیا؟ انہوں نے مالکانہ غرور سے کہا کہ صحافی کچھ پڑھتے نہیں اور باتیں بڑی کرتے ہیں، پھر مجھے بھی مطالعے کا مشورہ دیا۔ یہ بات کہنے کا اُن کا انداز آسمانی بجلی کی طرح تھا اور میرے لئے میری سیاسی تربیت زندگی بھر کے مطالعے کے لئے گالی کے مترادف تھا۔ تب میں نے کہا جناب بیشک ہم آپ کی نوکری کے لائق نہ ہوں لیکن ہم جاہل نہیں ہیں کیونکہ اسلام آباد میں وردی اور شیروانی والے بھی بلوچوں کو جاہل اور نااہل سمجھتے ہیں، لیکن ہم دنیا کا ہر مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔

اس چینل کے مالک نے کوئٹہ کیلئے نہ جانے کیا فیصلہ کیا لیکن مجھے ایک بات یاد آ گئی کہ ایک بادشاہ کے دربار میں سائل حاضر ہوا، صدا ماری اور مدد طلب کی تو بادشاہ نے کہا فقیر آج تیری قسمت دیکھتے ہیں۔ بادشاہ نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ داڑھی کے جتنے بال گریں گے، اتنے روپے تمہیں دیے جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ کی ہتھیلی خالی تھی تو فقیر نے کہا بادشاہ سلامت جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ بادشاہ نے اجازت دی۔ فقیر بولا بادشاہ سلامت داڑھی مبارک آپ کی ہو اور ہاتھ میرے ہوں، پھر دیکھئے میری قسمت۔

ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ اسلام آباد سے مختلف ناموں اور حوالوں سے لوگ آتے ہیں، ہمارے بارے میں ایک نقطہ نظر طے کر کے آتے ہیں اور اپنے دل کی بات ہمارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔ خاطر خواہ جواب نہ پا کر ہمیں جاہل و نااہل قرار دے کر واپس چلے جاتے ہیں جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے درد کو ہم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ اسلام آباد والے جس مقام پر کھڑے ہو کر ہمیں دیکھتے ہیں، وہاں سے ہماری تصویر انہیں کبھی بھی درست نظر نہیں آئے گی۔ انہیں اپنی نظر کا زاویہ بدلنا ہوگا۔ میڈیا میں سرمایہ کاری سے عالم فاضل کا سرٹیفکیٹ نہیں مل جاتا۔ ایک صحافی واقعات کی بنیاد پر خود کو اَپ ڈیٹ کرتا ہے، اگر ہر علم پر دسترس حاصل کرے تو اس کے لئے ماسٹر ڈگری ہوتی ہے، پھر وہ ماہر علوم تو بن جائے گا لیکن صحافی نہ بن پائے گا۔ لیکن تھوڑا تھوڑا جاننے کیلئے بھی بہت کچھ جاننا اور پڑھنا پڑتا ہے اور خود کو ہر فن مولا سمجھنے والے نہ کچھ جانتے ہیں اور نہ پڑھتے ہیں۔ وہ تو بس اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے اور 'میں نہ مانوں' کی ضد پر قائم رہتے ہیں۔

(18 اگست، 2008ء)

رستہ طے ہو تو منزل آسان ہوتی ہے

جدید دنیا کو پُر امن بنانے کے خواہاں جاننا چاہتے ہیں کہ آخر ایشیا کے اس خاص خطے میں امن قائم کیوں نہیں ہو رہا۔ اسلام آباد کے قریب قبائلی علاقوں میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر جو قتل وغارت ہو رہی ہے، اس میں عالمی طاقتوں کی براہِ راست مداخلت ہے۔ ان علاقوں میں پاک فوج کو یرغمال بنالیا جاتا ہے، پھر ان کی لاشوں کا تحفہ بھیجا جاتا ہے اور حکومت وہاں مذاکرات کی بات کرتی ہے۔ فاٹا میں نیٹو فورسز اور امریکی فوج کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دوسری جانب حکومت کے نمائندے امن کیلئے جرگے میں شریک ہوتے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں حکومت کی رِٹ کو چیلنج کرنے والے تمام وہ لوگ ہیں جنہیں خود امریکہ بادشاہ نے مذہب کے نام پر پوری دنیا سے جمع کر کے روس کے خلاف لڑنے کیلئے تیار کیا تھا۔ اب افغانستان میں اپنی پسند کے نتائج حاصل کرنے کے بعد یہ مذہبی جنگجو امریکہ کے کام کے نہیں رہے لیکن ان جنگجوؤں کے پاس اب لڑنے اور مرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس لئے اب دونوں فریق ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ مقامی طالبان ریاست کے اندر ریاست بنائے بیٹھے ہیں اور اپنے انتہا پسندانہ خیالات کا ہر جگہ عمل چاہتے ہیں ہیئر کٹنگ سیلون اور وڈیو شاپس کو انہوں نے بہت پہلے ختم کر دیا تھا، اب وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کی تعلیم بھی گناہ ہے۔ اس لئے انہوں نے کئی گرلز اسکول نذر آتش کر دیے ہیں۔ حکومت انہیں روکنے میں مکمل ناکام ثابت ہوئی ہے اور ہر روز آپریشن بند کرنے پھر شروع کرنے کے غیر سنجیدہ فیصلے کئے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک عمل اسلام آباد سے بہت دور ایک ایسے علاقے میں جاری ہے جسے بلوچستان کہا جاتا ہے۔ حکومت کا غیر سنجیدہ عمل دونوں جگہ بیشک مشترک ہو مگر لڑنے والے اور ان کے مقاصد بالکل مختلف ہیں۔

قبائلی علاقوں میں ایسے لوگ پناہ گزین ہیں جو عالمی طاقتوں کی نظر میں دہشت گرد ہیں۔ ایسے مطلوبہ افراد کی تلاش میں عالمی طاقتوں کی دلچسپی ہے جبکہ بلوچستان میں کوئی بھی عالمی دہشت گرد موجود نہیں

لیکن عالمی طاقتوں کی دلچسپی کا مرکز ضرور ہے۔قبائلی علاقے تاحال ایک آزاد حیثیت میں موجود ہیں جبکہ بلوچستان، پاکستان کی وحدت ہے۔تمام علاقوں کی اپنی ایک جغرافیائی اہمیت ہوتی ہے۔اسی پس منظر میں بلوچستان کو ایشیا کا گیٹ وے کہا جاتا ہے۔بلوچستان کے سنہرے ساحل پر پوری دنیا کی نظریں ہیں لیکن یہ حقیقت اب سب پر عیاں ہے کہ یہاں لڑنے اور مرنے والے مذہب کے نام پر نہیں بلکہ اپنی سرزمین کی خاطر جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔اس جنگ میں کسی غیر ملکی امداد کا کوئی ہاتھ نہیں، نہ ہی بلوچ حکومت سے تصادم چاہتے ہیں۔بلوچستان کے سادہ لوح، پُرامن لوگوں کی خواہش ہے کہ ہمارے گھروں سے کوئی بھی چیز ہماری مرضی کے بغیر نہ اٹھائی جائے۔ہم کسے کیا دیتے ہیں، یہ طے کرنے کا حق ہمیں حاصل ہو۔اس ذراسی خواہش پر اگر بلوچوں پر بندوق تان لی جاتی ہے تو یہ عالمی انسانی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔آج اپنی سرزمین کی حفاظت کے جرم میں جن بلوچوں کی لاشیں گرائی جارہی ہیں، انہی کے آباؤاجداد نے پاکستان سے الحاق کے حق میں ووٹ دیا تھا۔بلوچوں کو آج شرپسند اور دہشت گرد کہا جارہا ہے، یہی اصطلاح فاٹا والوں کیلئے بھی استعمال ہورہی ہے لیکن وہاں حکومت آئے روز مذاکرات کی پیشکش کرتی رہتی ہے جبکہ بلوچستان میں ایسا کوئی سنجیدہ عمل دکھائی نہیں دے رہا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ حکومت کے دفاعی مشیروں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ فاٹا میں حکومت کے خلاف برسرپیکار عالمی دہشت گرد ہیں اور ان کی حمایت بھی عالمی سطح پر ہے اس لئے ان سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا' وہ ہرروز درجنوں فوجیوں کو ہلاک کردیتے ہیں پھر بھی مذاکرات کا فیصلہ کیا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب بلوچ ہے جو کمزور' لاوارث' محکوم ہیں اس لئے ان کی آواز کو طاقت کے ذریعے آسانی سے کچلا جاسکتا ہے۔اگر فیصلہ کرنے والی قوتوں کے ذہن میں کہیں بھی یہ بات موجود ہے تو یہ نہ صرف ملک بلکہ پورے خطے کیلئے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

طاقت اور جنگ' بم و بارود تو کسی بھی مسئلے کا حل نہیں، اس لئے حکمرانوں کو تمام فریقین سے مذاکرات ہی کرنا چاہئیں لیکن سب کو ایک ہی فارمولے سے خاموش کرانے کا طریقہ نہ صرف پرانا بلکہ ناکام بھی ہے۔جمہوری حکومت کو سمجھنا ہوگا کہ فاٹا اور بلوچستان میں جاری جنگ میں بہت نمایاں فرق ہے۔بلوچستان کے لوگ کسی بیرونی ایجنڈا پر عمل پیرا نہیں بلکہ وہ اپنے گھر کی اپنے وسائل کی حفاظت کررہے ہیں۔اس لئے جب جنگ مختلف ہو تو اسے روکنے کی حکمت عملی بھی مختلف ہوتی ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ بلوچوں نے طاقت کا غیر ضروری استعمال کرکے کبھی بھی کسی سرزمین پر مداخلت نہیں کی، نہ ہی اپنی ثقافت وروایات کو حرفِ آخر قرار دے کر اسے دنیا کیلئے لازم قرار دیا ہے۔بلوچ جس طرح کسی کے منہ کا نوالہ نہیں چھینتا

چاہتے بالکل اسی طرح اپنے بچوں کے منہ سے بھی کسی کو نوالہ چھیننے نہیں دیں گے' اپنے گھر' خاندان اور وسائل کی حفاظت تو حیوان بھی کرتے ہیں جب جنگل کے قانون میں بھی اس عمل کی اجازت ہے تو پھر اس جدید دنیا میں بلوچ کیا گناہ کر رہے ہیں۔ اگر پانچ آپریشنوں کے بعد بھی اربابِ اختیار یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچوں کو گولی سے خوفزدہ کر کے ان کے حقوق سے انہیں دستبردار کیا جاسکتا ہے تو یہ محض حماقت ہے کیونکہ ہتھیار بلوچوں کا زیور ہے اور مرنا مارنا بلوچوں کیلئے معمول کی بات ہے۔ اب فرق صرف یہ ہے کہ پہلے بلوچ قبائل آپس میں دست و گریبان ہوتے تھے جبکہ اب بلوچوں نے اپنی لڑائی کا رخ طے کرلیا ہے اور جب رستہ طے ہو تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔ اس لئے بلوچوں نے عام انسانوں کے مذہبی جذبات کو اشتعال میں لائے بغیر سب کا رشتہ سرزمین سے جوڑ لیا ہے اور جب یہ تعلق پختہ ہو جاتا ہے تو نہتے لوگ ٹینکوں سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور یہی منظر آج کے بلوچستان کا ہے۔

(20 اگست، 2008ء)

ہاں، بلوچ حق پر ہیں

دنیا میں جب مارکس اور اینگلس نے کمیونزم کا تصور پیش کیا تو سندھ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سے بہت پہلے سندھ کے صوفی بزرگ شاہ عنایت نے کہہ دیا تھا کہ ''زمین جو بوئے گا فصل وہی کھائے گا'' جھوک کے اس بزرگ نے وجدانی کیفیت میں 'انا الحق' کا نعرہ لگایا تو حاکم وقت نے سازش کر کے شاہ عنایت کو شہید کر دیا۔

ملکیت پر حق کا تصور کمیونزم کا ہو یا شاہ عنایت کا، وہ یہی ہے کہ جو جس زمین پر اپنے آباؤ اجداد سے موجود ہے وہاں کے تمام ظاہری و باطنی وسائل پر صرف اس کا حق ہے۔ پر جب طاقت کے زور پر ملکیت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوئی تو علما کرام نے کہا کہ اگر کسی کو اللہ دیتا ہے تو یہ اس کی قسمت ہے۔ اس بیان سے طاقتور سرمائیدار، جاگیردار کو مذہبی تحفظ حاصل ہو گیا، جس سے غربت اور مظلومیت افراد سے بڑھ کر قوموں تک آ پہنچی اور 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کی بنیاد پر طاقتور مقتدر حلقوں سے قوموں کے وسائل پر قبضہ گیری شروع کر دی۔ ان زیادتیوں کا ذکر ہم اپنے ہمسائے صوبہ سندھ سے تو سنتے آئے ہیں جہاں کی زمین زرخیز ہے۔ معدنی وسائل بے شمار ہیں، عظیم الشان صحرا ہیں، دریائے سندھ ہے لیکن سب پر طاقتور لوگوں کا قبضہ ہے۔ ان کی مظلومیت کا احساس ہمیں اس وقت ہوا جب قبضہ گیروں کے قدم ہماری سرزمین پر پہنچے۔ بلوچستان کے پہاڑوں کیلئے کہا جاتا ہے کہ ان میں قدرتی دولت کے اتنے ذخائر ہیں کہ بلوچوں کو آنے والی نسلوں تک کوئی فکر نہ ہو۔ گیس کی پیداوار سب سے زیادہ بلوچستان سے ہوتی ہے لیکن یہ سب وسائل بلوچوں کے کسی کام تب آ سکتے ہیں جب ان پر بلوچوں کا حق ہو، کیونکہ گیس جب سوئی سے نکلی تو پورے پاکستان تک پھیل گئی لیکن کئی سالوں تک بلوچستان خود محروم رہا۔ سوئی گیس کی پیداوار کتنی ہے، افرادی قوت کیا ہے، ان سب سے سوئی کے اصل باشندے بے خبر تھے۔ پھر جب سینڈک پراجیکٹ کا آغاز

ہواتو بلوچستان کے پہاڑوں سے سونے کا دریا بہنے لگا۔ پھر کس سے کیا معاہدہ ہوا، مقامی لوگوں کو کچھ علم نہ تھا اور جب گوادر کا سلسلہ شروع ہوا تو پوری دنیا کو ہر چیز کی خبر تھی لیکن گوادر کی زمین اصل بلوچوں سے کوڑیوں کے مول خرید کر لالچی لوگ اپنی قسمت چمکا رہے تھے اور بلوچ اندھیروں میں ڈوبتے جارہے تھے۔ گوادر سے متعلق ہر روز نئے معاہدے ہورہے تھے لیکن ان معاہدوں میں کوئی بھی بلوچ شریک نہ تھا۔

سرزمین بلوچستان پر اجنبی ترقی کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ابھی کچھ روز قبل پھر ایک خبر آئی کہ بلوچستان کے ریکوڈک پراجیکٹ کیلئے حکومت نے تین غیر ملکی کمپنیوں سے معاہدہ کیا ہے اور عجب بات یہ ہے کہ جمہوری حکومت کے اس معاہدے میں بھی بلوچستان کا کوئی نمائندہ شامل نہ تھا۔ عالمی ماہرین کے مطابق ریکوڈک کے پہاڑوں میں اعلیٰ معیار کے سونے اور تانبے کے ذخائر موجود ہیں جو عالمی مارکیٹ کے مطابق 65 ارب ڈالر کے مالیت سے زائد کے ہیں، جو وفاقی حکومت نے آسٹریلیا، کینیڈا اور چلی کی کمپنیوں کو 21 ارب ڈالر میں فروخت کئے ہیں۔ آسٹریلوی بتھن کاپر کمپنی، کینیڈین بیرک کود کارپوریشن اور چلی کو انٹیلو فاگستا کمپنی نے ان کل ذخائر کا 79 فیصد تانبا اور سونا حاصل کرنے کیلئے کھدائی اور تلاش کا کام شروع کردیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ 65 بلین ڈالر کے معدنی وسائل کا نام تو گھر مالکان سے پوچھے بغیر دیا گیا ہے اور پھر بلوچستان کا حصہ 25 فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ دنیا کے بہترین سونے کے ذخائر کے سودے میں بتایا جارہا ہے کہ حکومت کو 44 بلین ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ کہیں بھی رپورٹ نہیں ہورہا کہ اس سودے سے بلوچ اور بلوچستان کو کتنا نقصان ہوگا کیونکہ ہمارے گھر کی چیز ہماری اجازت کے بغیر اٹھا کر کسی کو فروخت کی جائے اور پھر اپنی مرضی سے ہمیں خیرات کے برابر حصہ دیا جائے تو یقیناً یہ گھاٹے کا سودا ہے اور بلوچستان ایسے گھاٹے کے سودے کر کر کے اب تھک چکا ہے، اس لئے تو آج کا بلوچ اپنے حقِ ملکیت کی جنگ لڑ رہا ہے۔

اگر ہمارے حکمران معاہدے کے معاملوں سے ناواقف ہیں تو کم از کم غیر ملکیوں کو تو یہ اندازہ ہونا چاہئے کہ وہ جس سرزمین کے وسائل کے کام کا معاہدہ کر رہے ہیں، وہ اصل مالکان کی شرکت کے بغیر کیسے ممکن ہوگا۔ اب جب یہ غیر ملکی کمپنیاں یہاں کام شروع کریں گی تو ان کے تحفظ کی ضمانت کون دے گا۔ معاہدے میں یہ طے ہوا ہے کہ کام میں مقامی لوگوں کو روزگار دیا جائے گا۔ اگر یہ سب چیزیں واضح نہیں تو 25 فیصد کی خیرات بلوچوں کے مسائل کا حل نہیں۔ اب ویسے ہی بلوچوں کے گھروں، روزگار، پہاڑوں، میدانوں، چراگاہوں اور وسیلوں پر فیصلے کا حق بلوچوں کے پاس نہیں لیکن یہ حق جب بلوچوں نے حاصل

کرلیا تو پھر تمام وعدے، معاہدے والحاق اپنی افادیت کھو بیٹھیں گے۔ پھر نئے معاہدے ہوں گے، برابری کی بنیاد پر اور بلوچ اپنے وسائل کی تقسیم کے فیصلے خود کریں گے۔ بلوچوں نے اب بھی 'انا الحق' کا نعرہ بلند کیا ہوا ہے۔ بہت جلد پوری دنیا ہم آواز ہو کر کہے گی کہ ہاں بلوچ حق پر ہیں اور جب دنیا کسی تحریک کو، کسی آواز کو حق کی آواز قرار دیتی ہے تو تمام زیادتیاں، مظالم اس کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ پھر برابری کا عزت کا احترام کا سفر شروع ہوتا ہے اور یہ سفر بلوچوں نے طے کرنا ہے۔ یہ سفر قوموں کو ایسی پختگی و پائیداری عطا کرتا ہے کہ پھر ان کے وسائل کی تقسیم کا فیصلہ کوئی تیسرا فریق نہیں کرتا۔

(21 اگست، 2008ء)

اب کی بار گمراہ نہ ہونا یارو

اس کرہِ ارض پر جس طرح انسانی تضادات اور گروہی مفادات موجود رہے ہیں، بالکل اسی طرح ان تضادات وتصادم نے کئی تحریکوں کو بھی جنم دیا ہے۔ اپنے حقوق کے حصول کیلئے شروع ہونے والی شعوری جدوجہد کا راستہ روکنے کیلئے بھی ہر دور میں ظاہری و باطنی قوتیں سرگرم رہی ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کے دیوتا کو ابوجہل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر ایک عظیم مقصد کیلئے ابھری ہوئی تحریکوں کو منفی نام دے کر ان کا رخ موڑ دیا جاتا ہے اور متحد و منظّم عوام سے خوفزدہ طبقہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر کے چین کی نیند سوتا ہے۔ ایسے واقعات وتجربات آج کی بات نہیں بلکہ دنیا کے مظلوم انسان جب پیرس کمیون کے ذریعے پورے جہاں کو تبدیلی کا رستہ بتا رہے تھے تو تب بھی ابوجہل کے گروہ نے اپنا کام کر دکھایا اور دنیا کا پہلا انقلاب قلیل عرصے میں ہی اپنے اختتام کو پہنچا۔ پھر روس اور ایران میں بھی اس طرح تحریکوں کو مقاصد کی منزل سے گمراہ کیا گیا اور جب افغانستان کی باری آئی تو طالبان کے نام پر سادہ لوح عوام کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ کیونکہ اس سے قبل متحدہ ہندوستان کے دور میں مذہب کے نام پر کامیاب تجربات ہو چکے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب برصغیر میں دو بنیادی رجحانات موجود تھے جن میں ایک رجحان پسے ہوئے محنت کش طبقے میں بغاوت کا تھا۔ یہ رجحان بیسویں صدی کی ابتدا میں سامنے آیا اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ ہندوستان میں واحد غیر فرقہ وارانہ رجحان تھا جس میں ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ سب شامل تھے۔ اس سوچ کے سائے میں ہزاروں انقلابی پیدا ہو چکے تھے جو ایک غیر طبقاتی تبدیلی کیلئے کوشاں تھے۔ پھر اس تحریک کا سامنا کرنے کیلئے دوسرا رجحان 'معتدل سیاست' کا پیش کیا گیا جس میں مسلم لیگ اور کانگریس کا نام لیا جانے لگا۔ تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ برصغیر میں عظیم مقصد کی انقلابی تحریک کو منتشر کرنے کیلئے جناح اور گاندھی کے کردار تخلیق کیے گئے، جنہوں نے عوام کو مذہب

کے نام پر استعمال کر کے محنت کشوں کی جدو جہد کو تقسیم کیا۔ یہی تجربہ دونوں ممالک میں تاحال جاری ہے کیونکہ ہم جس یورپ کی تقلید کرتے ہیں خود وہاں بھی جمہوریت ایسے طبقے کے ذریعے آئی جس کے مفادات جاگیرداروں سے متصادم ہورہے تھے چنانچہ جاگیرداروں کو شکست دینے کیلئے ابھرتے تجارت پیشہ طبقے نے جمہوریت کا نعرہ لگایا۔ اگرچہ وہ طبقہ جمہوریت سے مخلص نہیں تھا لیکن وہ اس نعرے کے تحت معاشرے کے دیگر طبقات کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتے تھے، بالکل یہی طریقہ اپناتے ہوئے ہمارے متوسط طبقہ نے بھی نہ چاہتے ہوئے جمہوریت کا نعرہ لگایا، کیونکہ قیام پاکستان کے بعد انگریزوں کی جگہ فوج اور بیوروکریسی نے لے لی تو ہمارے متوسط طبقہ' سرمایہ دار اور جاگیردار کے مفادات ان سے وابستہ ہو گئے۔ حالانکہ جمہوریت سے عوام کے براہ راست مفادات وابستہ ہیں لیکن فیصلہ سازی کے عمل میں عوام کو دُور رکھا گیا، اس لئے پاکستان کی سیاست میں عوام کا متحرک اور فعال کردار نہ ہونے کی وجہ سے ہر دور میں صدر' وزیراعظم اور آرمی چیف کا ٹرائیکا بن جاتا ہے۔ پھر بھی ہر حکومت 'عوام کی نمائندہ' ہونے کی دعویدار ہوتی ہے۔

دنیا میں سوشلسٹ اور جمہوری تحریکوں کا پھیلاؤ روکنے کیلئے مذہب کو استعمال کر کے طالبان جیسی مخلوق پیدا کی گئی۔ ان طالبان کو ریموٹ کنٹرول پر چلانے والے اس بات سے بے خبر تھے کہ آگے کی طرف جانے والے یہ طالبان پیچھے بھی آسکتے ہیں۔ اپنی خارجہ پالیسیوں میں ایڈونچر کرنے والے ممالک، آج طالبان کے طوفان کو بھگت رہے ہیں اور دنیا پر حکمرانی کے شوق میں بیک وقت کئی جنگیں چھیڑنے والا امریکہ بھی اب عراق سے نکلنے کا شریفانہ راستہ تلاش کر رہا ہے۔ ماضی میں ایسے حالات میں ویت نام میں امریکہ کو جو خواری ملی تھی وہ اب تک اسے نہیں بھول پایا لیکن ان جہادیوں سے اظہارِ لاتعلقی کے باوجود پاکستان وامریکہ اپنی جان نہیں چھڑا سکتے اور یہ بات پوری دنیا جانتی ہے کہ طالبان کی جس جنگ کو جہاد کا نام دیا گیا تھا، وہ کوئی مذہبی مشن نہیں بلکہ سیاسی ومعاشی مفادات کے تحفظ کی جنگ تھی اور یہ مفادات آج بھی برقرار ہیں جن کی جنگ افغانستان و پاکستان میں بیٹھے طالبان بخوبی لڑ رہے ہیں۔ اب موجودہ جمہوری حکومت کے دعویدار بے شک یہ کہتے رہیں کہ وہ ملک کو طالبان کے حوالے نہیں کریں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کا بہت بڑا احساس حصہ ان کے حوالے ہو چکا ہے اور حالیہ واہ کینٹ آرڈیننس فیکٹری میں خودکش دھماکہ کر کے انہوں نے حکومت کو یہ پیغام بھی دیدیا ہے کہ سرکار کی کوئی بھی چیز ان سے محفوظ نہیں۔

ان حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی پُرتشدد کارروائیاں صرف جمہوری حکومت کو ناکام کرنے کیلئے ہیں یا اس کے علاوہ بھی ان کے کوئی مقاصد ہیں۔ دنیا کی بامقصد تحریکوں کو گمراہ کرنے کی سازشوں کا مختصر جائزہ لینے کے بعد ہمیں بلوچستان میں جاری تحریک کو اس تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد جب بلوچستان کا جبری الحاق ہوا تھا تو ریاست قلات کے حکمران خاندان کے اہم فرد نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ پھر یہ سلسلہ نوروز بلوچ، حمید بلوچ، شیروف مری، عطا اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، نواب اکبر خان بگٹی، بالاچ مری سے ہوتا ہوا براہمدغ تک آ پہنچا ہے۔ اس دوران قربانیوں کا عمل بھی کہیں نہیں رکا لیکن پھر بھی بلوچ مزاحمتی تحریک کو وہ نتائج حاصل نہیں ہو پائے جس کے لئے بلوچ عوام پُرامید تھے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ ایک سازش کے تحت بلوچ قبائل کا ایک دوسرے سے تصادم کرایا گیا جو خونی جنگ میں تبدیل ہوتا رہا۔ تمام سردار ایک دوسرے کے خلاف دست و گریبان رہے۔ پھر جب بلوچ ذرا متحد ہونے لگے تو بلوچ قبائل کے نام سے منسوب چھوٹے چھوٹے گروہ تشکیل دیے گئے۔ پھر بلوچ، غیر بلوچ کی کہانی شروع ہوئی اور مذہب کا جال بھی بلوچستان میں پھینکا جاتا رہا ہے۔

ان تمام سازشوں کے باوجود بلوچ قومی تحریک مسلسل اور مستقل جاری ہے اور اب جس طرح قومی شعور و جذبات میں منظم شکل میں اضافہ ہوا ہے تو بلوچستان کی قومی قیادت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمی سازشوں سے قوم کو بچائے اور بلوچ معاشرے میں قومی شعور کی جڑیں اتنی مضبوط ہونی چاہئیں کہ اب مختلف پرکشش نعروں، مراعات اور پیشکشوں سے اس کارواں کو گمراہ نہ کیا جاسکے۔ کیونکہ عظیم مقصد کی جاری یہ جدوجہد اگر اب منتشر یا گمراہ ہوئی تو اس سرزمین کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا اور یہ بات وہ بھی جانتے ہیں جو تحریک کو منتشر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ پوری دنیا کو خبر ہے کہ یہ فیصلہ کن جنگ ہے اور آخری جنگ میں جیت ہمیشہ عوام کی اور سچ کی ہوتی ہے۔ اس لئے مکر، جھوٹ وفریب سے اکثریت پر حکمرانی کرنے والی اقلیت کو اپنی شکست کا خوف ہے، اپنے انجام سے ڈر ہے۔ بس ہمیں اپنے لوگوں کی طاقت پر پختہ یقین کر کے اپنے مقصد پر ثابت قدم رہنا چاہئے، بس اب کی بار گمراہ نہ ہونا یارو!

(25 اگست، 2008ء)

رشتوں کا کوئی امتحاں نہیں ہوتا

انسانی عادات واطوار کسی بھی انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں، جن سے اس کے ماحول، تربیت اور دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے' جبکہ علم کے دروازے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ' انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔' بس اپنی اس پہچان اور شناخت کی تلاش میں ہم نے اپنی عمر کا تہائی حصہ گزار دیا اور پھر ''میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل' لوگ ملتے گئے' تنہا کرتے گئے'' کے مصداق زندگی کے میلے کی بھیڑ میں بھی ہم اکیلے ہی رہے۔ ہم نے اپنا بچپن' سرخ کتابوں' کے سائے میں بتایا اور نصاب کی ڈگری کیلئے سماجی سائنس کا انتخاب کیا۔ دونوں علوم نے ہمیں دنیا کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ دیا۔ ہم نے یہ تو جان لیا کہ دوست اپنی ذات کی پرچھائی یا سوچ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی نہیں ہوتا' پھر بھی اندر میں ایک دبی خواہش ضرور موجود تھی کہ ہمارے حلقے میں جو بھی شریک ہو وہ ہمارے محدود دائروں میں اس طرح مقید ہو جائے کہ دنیا کو ہماری نظر سے دیکھے اور ہماری فکر سے سوچے۔ ہم آہنگی کے اس شوق نے ہمیں تنہائیوں کی تاریکیوں میں مزید غرق کر دیا۔ زندگی کے سفر میں سیکڑوں لوگ ہم سفر ہوئے۔ ہم نے ہر ایک کو اپنے معیار سے پرکھا اور اس پیمانے پر پورا نہ پاکر ہم نے تعلق ترک کر دیا اور دوستی نہ نبھانے کے قصور وار ٹھہرے۔

موجودہ دور میں جب لباس اور ہیئر اسٹائل لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے لگا اور بیک وقت کئی معاشقوں میں مشغول نوجوان کو' باصلاحیت' سمجھا جانے لگا، ہم نے تب بھی یہی تبلیغ کی کہ عشق اور ہوس میں فرق ہونا چاہئے' جس طرح ہر مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے حصے کی عورت صرف اس کی ذات تک محدود رہے تو بالکل یہی خواہش ایک عورت کی بھی ہوتی ہے' لیکن اس مردانہ سماج میں ہم نے عشق کی یہ آزادی بھی صرف مرد تک قبول کی ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو ہر روز مرد بدلنے والی عورت کو جن القابات سے یاد کیا جاتا ہے، وہی خطاب یکساں عمل کرنے والے مرد کو بھی عطا کئے جاتے۔ مجھے زندگی میں بہت اچھے

مخلص، چاہنے والے، خیال رکھنے والے دوست ملے ۔مگر عشق وعورت کے معاملہ پر ان کی وہی سطحی سوچ ہوتی کہ دنیا کی ہر عورت صرف استعمال کرنے کی چیز ہے، میرا ان سے اکثر اختلاف رہتا بالآخر وہ مجھے طعنہ دیتے کہ دراصل تمہاری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی یا تمہیں کوئی موقع نہیں ملا اس لئے تم اوروں کو برداشت نہیں کرتے۔ان کے بقول میرا احساسِ محرومی مجھے مشتعل کرتا ہے۔ بہرالحال اس بنیاد پر میں نے کئی دوست گنوائے، دوچار کی سرگرمیاں حد سے تجاوز کرگئیں تو میں نے اخبار میں مضامین بھی لکھے۔ یہ میری بچپن سے کمزوری ہے کہ میرے دل میں جن سے اپنائیت واحترام کا رشتہ ہوتا ہے ان سے میں کبھی براہِ راست ہمکلام نہیں ہوسکا، پھر ہمیشہ میرے اظہار کیلئے قلم اور کاغذ ہی میرے مددگار بنے ہیں۔ غلط عمل کوئی بھی کرے مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ پھر رشتوں کی تفریق ختم ہوجاتی ہے۔ مجھے انگلی سے پکڑ کر شعور کے پُرخار راستوں پر لانے والے کو جب میں نے اس عمل میں ملوث پایا تو نہ صرف میں اندر سے چکنا چور ہوا بلکہ اپنی حالت پر بہت کچھ لکھ بھی دیا، پھر میں نے اپنے ایک بچپن کے دوست کی اس معاملہ پر آخری حد تک تذلیل کی اور ایک دوسرے دوست سے معاملہ ہاتھا پائی تک جا پہنچا۔اب میں کسی نفسیاتی مرض میں مبتلا ہوں یا مجھے کوئی اور جنون ہے لیکن اپنی اس سوچ کی بنا پر زمانے کے حاوی لوگوں نے مجھے تنہا کردیا ہے۔

میرے رشتے میں عزیز محترم بہت سارے ایسے ہیں، وہ جب دوستوں کی محفلوں میں ہوتے ہیں تو محفل کی جان ہوتے ہیں، ان کے بغیر محفل کے رنگ ادھورے ہوتے ہیں، ان کی شخصیت کا سحر اور خوش اخلاقی کا جادو سب کو متاثر کرتا ہے، لیکن وہی شخص جب اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو رعب، دبدبہ ہوتا ہے بلکہ آسان الفاظ میں یہ کہ چہرے پر نحوست چھائی رہتی ہے۔سیکڑوں لڑکیوں کے لئے ان کے پاس وقت ہوتا ہے اور وہ ان خواتین کے مسائل پر گھنٹوں پریشان رہتے ہیں، بحث کرتے ہیں لیکن اپنی بہن اور ماں سے چند لمحوں کی گفتگو کا وقت نہیں ہوتا۔ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو جانتا ہوں جو کسی بھی اجنبی نسوانی آواز سے فون پر تفصیلی بات کرتے ہیں مگر اپنے عزیز واقارب کی خیریت جاننے کیلئے مہنگائی کا بہانہ ان کے سامنے رکاوٹ بن جاتا ہے۔ میرا ایک بہت ہی قریبی عزیز ہے جس پر بچپن سے یہ چھاپ ہے کہ وہ ہماری پرچھائی ہے؛ اس کی تعلیم، تربیت اور شعور کے سفر تک ایک رہنما کی طرح میرا اس سے ساتھ رہا۔ ہر ٹھوکر پر ہم نے اسے سنبھلنا سکھایا مگر جب جوانی کی سرحدوں پر اس نے عورت پرستی کے رنگ میں ڈھلنا شروع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ یہ باب تو میری تربیت کے نصاب میں نہ تھا۔ پھر جب دس لڑکیوں سے عشق کے وعدے کرکے وہ کسی ایک کے ساتھ نبھانے کی کشتی میں سوار ہوا تو پیار کے سمندر میں اتنا دُور

چلا گیا کہ ہمارے درمیان رابطہ منقطع ہوگیا۔ پھر ایک روز اس کی کشتی منجدھار میں پھنسنے کی خبر آئی تو پورے خاندان نے اپنی اناؤں کی پشت پر بٹھا کر اسے زندگی کے کنارے تک پہنچایا' وہ انسان خود سے شعوری طرح ہماری چھاپ مٹاتا رہا۔ اپنی کامیابیوں کے سہرے کسی اور کے سر سجاتا رہا۔ مگر ہمیں تو اپنی تخلیق عزیز تھی، اس لئے یہ خوف تھا کہ عشق کی ناکامی مایوسی بن کر کہیں اسے ضائع نہ کردے تو اس ٹھوکر کھائے شخص کی ہم نے پھر انگلی پکڑی اور اُمید کی کہ اب وہ پھونک پھونک کر چلے گا لیکن اٹھتے ہی اس کی نہ چال بدلی اور نہ ڈھال۔ عورت کوئی بھی ہو آج بھی اس کے لئے باعث دلچسپی ہے۔ پھر وہ خواتین کے حقوق اور بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر جتنا اچھا بولتا اور لکھتا ہے کاش کہ عمل میں بھی ویسا ہوتا۔ اب جب وہ زندگی میں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے تو میری خوشی اس مالی کی مانند ہے جو اپنے ہاتھوں سے لگائے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر پھولے نہیں سماتا' اس درخت کا میوہ کوئی بھی کھائے لیکن جب یہ پودا تھا تو اسے گرمی، سردی سے بچانے اور اسے درست وقت پر کھاد اور پانی دینے کا سہرا مالی کو ہی جاتا ہے۔ زندگی میں انسان کچھ کرے تو اس کے پیچھے کسی ایوارڈ' کریڈٹ یا تعریف کی لالچ نہیں ہوتی' یہی کافی ہوتا ہے کہ انسان کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ باقی یہ تو دنیا کا اصول ہے کہ کسی عمارت کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھنے والے کاریگر کے بجائے ذکر ہمیشہ چھت بنانے والے یا عمارت کے رنگساز کا ہوتا ہے لیکن اس بنیاد کار کی اہمیت کبھی ختم نہیں ہوتی' اسی طرح آج جب وہ ایک مقام پر' منزل پر پہنچا ہے تو ہمارے درمیان عزت' احترام اور شاید اختلافات کے اتنے غیر ضروری فاصلے بڑھ گئے ہیں کہ اس سے بات کرنے کیلئے میں کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں' بات کیا تھی دل کی خواہش تھی کہ اسے کہہ ڈالوں کہ نوجوانی اور لا اُبالی عمر گزر گئی اب اپنے مقام' حیثیت اور مرتبے کے مطابق اسے اپنے سلوک اور زندگی کے سلیقے بھی بدلنے چاہئیں' میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ جب اس کی تعریف کریں کہ کم عمری میں اس نے بہت محنت کی' بہت سیکھا' اچھا بولتا ہے' بہترین لکھتا ہے' کچھ کر گزرنے کا جنون ہے لیکن...... بس یہی میں چاہتا ہوں کہ کوئی 'لیکن' کبھی اس کے احترام میں رکاوٹ نہ بنے' ہر تخلیق کار اپنی پراڈکٹ کا بہترین ڈسپلے چاہتا ہے' اگر میں یہ چاہتا ہوں تو اس میں کیا برائی ہے! لیکن اسے کہنے سے قبل میں نے جب یہ باتیں کسی تیسرے شخص سے شیئر کیں اور اپنی خواہش بتائی تو اس نے مجھے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا کہ کئی معاشقے تمہاری اس 'تخلیق' کی عادت بن چکے ہیں اور وہ اسے غلط عمل نہیں سمجھتا بلکہ اپنی آئندہ نسل کو بھی اس راہ پر لانے کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔ اس تیسرے شخص نے کہا کہ تمہارے اس 'پودے' کا کہنا ہے کہ میرے نام نہاد مالی کے اپنے کئی معاشقے ہیں اور

ہمیں فضول تبلیغ کرتا رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ میری تمام نوکریوں سے برطرفی اور دوستوں سے تنازعات کی بنیادی وجہ بھی میرے معاشقے ہیں! اس سے آگے وہ تیسرا شخص کیا کچھ کہتا رہا مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا اور وہ الفاظ مجھ پر بجلی بن کر گرے تھے۔ میرا مان' میرا فخر' غرور سب کچھ ایک پل میں شرمندگی بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی' کراہت ہونے لگی کہ بچپن سے ایک سائے کی طرح میرے ساتھ رہنے والا مجھے اتنا جان پایا ہے اور دکھاوے کے احترام والا شخص اپنے اندر میں میرے لئے یہ جذبات رکھتا ہے۔ اپنی باتیں تو میں اسے نہ کہہ پایا لیکن اس روایتی رویے اور سوچ پر افسوس ہونے لگا کہ اگر کوئی تمہاری بہتری کیلئے اصلاح وتنقید کا ارادہ کرے تو تم اس کے کردار پر اتنا بڑا حملہ کردو کہ وہ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ کر پائے۔ میں نے اپنے اصولوں کی پاسداری کیلئے کئی مراعات' پیشکش' سہولیات وفوائد اور نوکریاں گنوائی ہیں' دل کے رشتے قربان کئے ہیں' دوستیاں وتعلقات ترک کئے ہیں' ہر روز تنقید کے ایک نئے طوفان کا سامنا کیا ہے اور ان سب باتوں سے وہ باخبر ہے۔ اس کے باوجود اس کے اپنے خیالات میرے وجود کو نابود کرنے کیلئے کافی تھے' یہ تو ایسے ہے کہ اگر کوئی گند صاف کرنے کے ارادے سے آئے اور آپ پورا گند اٹھا کر اس پر ڈال دیں' لیکن کیا اس عمل سے صفائی کے ارادے ختم ہو جائیں گے؟! اگر نہیں تو پھر میں بھی اپنے ارادوں پر قائم ہوں' طنز وتنقید کے طوفانوں سے نبرد آزما ہوتے عمر کا بہت بڑا حصہ گزار دیا ہے' اب باقی عمر کا آخری حصہ بھی گزر جائے گا لیکن میں اپنا غرض ضرور پورا کروں گا۔ نئے پودے لگا تا رہوں گا پھر انہیں زمانے کی ہواؤں سے بھی بچاؤں گا' مالی جو ٹھہرا' جس کی قسمت میں پھل کھانا نہیں لکھا۔

بس انسان اگر اپنی سوچ میں پختہ اور ارادوں میں مضبوط ہو تو انفرادی رویے کبھی بھی رکاوٹ نہیں بنتے' ہاں تمام قریبی لوگوں کو اپنا عکس بنانے کی خواہش شاید انسان کو تنہا کر دیتی ہے' اس لئے تمام رشتوں کو کسی امتحان میں ڈالے بغیر جہاں تک وہ آپ کے ساتھ چل سکتے ہیں انہیں قبول کر لینا چاہئے کیونکہ رشتے تو جلتی ہوئی گیلی لکڑی ہیں جو نہ مکمل جلتی ہے اور نہ بجھ جاتی ہے' بس اس سے ہر وقت دھواں اٹھتا ہی رہتا ہے۔ اب پیار کے پانی سے آپ اس آگ کو جتنا ٹھنڈا کر سکتے ہیں کوشش کرتے رہیں' اس امید کے ساتھ کہ رشتوں کے مابین سچائی' اعتماد' عزت واحترام ہر زمانے میں قائم رہے۔

(27 اگست، 2008ء)

ظلم بلاتفریق ہوتا ہے

قوم ایک درخت کی مانند ہے اور غلط وغلیظ روایات اس درخت کی بیماری زدہ خشک شاخیں ہوتی ہیں جسے کاٹ کر الگ کر دینا اس درخت کیلئے فائدہ مند ہوتا ہے تاکہ وہ بیماری پوری درخت کو نہ جکڑ لے ویسے بھی برائیاں اور غلطیاں ہر معاشرے وقوم میں ہوتی ہیں لیکن قوم کے باشعور وسنجیدہ افراد کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان بیماریوں اور برائیوں کی تشہیر کرنے کے بجائے ان کے خاتمے کیلئے اپنا کردار ادا کریں کیونکہ اگر گند کو آپ صاف کرنے کے بجائے پھیلا دیں گے تو پورے معاشرے میں بدبو پھیل جائے گی۔ موجودہ دور میں عوام کی رائے پر اثر انداز ہونے والا سب سے موثر ذریعہ میڈیا ہے۔ میڈیا کی یہ ذمہ داری ضرور ہے کہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی ضرور کرے مگر ان کا ذکر اس طرح ہو کہ لوگوں کو کوئی ترغیب نہ ملے اور اچھائیوں کی حوصلہ افزائی کر کے یہ تشہیر کی جائے کہ معاشرے میں صرف برائیاں نہیں اچھائیاں بھی اپنی طاقت سے موجود ہیں لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب میڈیا کے اداروں میں ترقی پسند' انسان دوست و باشعور افراد حاوی ہوں۔ مگر یہاں میڈیا کا مقصد صرف بریکنگ نیوز ہے جس کے ذریعے تجسس پھیلا کر خبر کی صحت کا فیصلہ بعد میں کیا جاتا ہے۔ یہی کچھ گزشتہ چند ہفتوں سے بلوچستان کے ضلع نصیر آباد میں رونما ہونے والے واقعے سے متعلق ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے کی دوڑ میں ٹی وی چینل نے یہ خبر بریک کردی کہ پانچ خواتین کو زندہ درگور کیا گیا ہے پھر کبھی سات' کبھی گیارہ کا ذکر ہوتا رہا اور آخر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں دو خواتین کے قتل کی تصدیق ہوئی۔

اسلام آباد میں ایک طرف میڈیا کے نیم حکیم دانشور تھے، دوسری طرف بلوچستان کے کمزور وکیل جبکہ تیسری جانب خواتین اور انسانی حقوق کے نام نہاد ادارے تھے جنہیں صرف اس واقعے میں خواتین کی مظلومیت یاد آ رہی تھی۔ حالانکہ یہ تنظیمیں اس وقت خاموش تھیں جب ایک غیر بلوچ عورت ڈاکٹر

شازیہ خالد کی خاطر شہید اعظم نواب بگٹی نے اپنی جان کا نذرانہ دیا۔ بلوچوں کو جاہل ثابت کرنے والے آج تک کوئی تاریخی حوالہ نہیں دے سکے جہاں لکھا ہو کہ زندہ درگور کرنا بلوچ روایات کا حصہ ہے۔ بلوچ معاشرے کے گھروں میں آج بھی انتظامی امور ایک خاتون کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور خواتین کو ایک اعلیٰ درجہ حاصل ہے۔ اگر انسانی حقوق کی تنظیموں کو اتنی ہی فکر ہے تو حال ہی میں سوئی میں ہونے والے جنسی زیادتی کے ایک اور واقعے پر وہ کیوں خاموش ہیں، صرف اس لئے کہ ماضی کی طرح اس بار بھی اس شرمناک واقعے میں زیادہ طاقتور و بااثر ملزمان ملوث ہیں۔ بلوچستان کے جس جس علاقے میں قبائلی نظام اپنے پورے جوہر اور بھرپور طاقت سے موجود ہے، وہاں ظلم و زیادتی کا شکار بغیر کسی جنسی تفریق کے اکثریتی عوام ہوتے رہتے ہیں۔

بلوچستان کے سندھ سے ملحقہ علاقوں میں غیر اخلاقی سرگرمیاں عام ہیں۔ کچھ روز قبل مٹھڑی میں ایک بچے کے ساتھ زیادتی ہوئی لیکن یہ واقعہ کسی انسانی حقوق کی تنظیم کے نوٹس پر نہ آسکا بلکہ جعفر آباد میں بچوں کے حقوق کیلئے کام کرنے والی ایک سماجی تنظیم بھی اس معاملے پر کچھ نہ کرسکی۔ حالانکہ اس تنظیم کا مقصد ہی یہی ہے کہ ایسے متاثرہ بچوں کی بحالی اور ان کی قانونی مدد کی جائے اور اس قسم کے واقعات جعفرآباد، نصیرآباد، سبی، بولان میں قدرے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس تنظیم کے مقامی افراد رونما ہونے والے واقعات کی تعداد پر مبنی رپورٹ تشکیل دے کر اپنے ہیڈ آفس ارسال کردیتے ہیں اور آئندہ کسی اور واقعے کا انتظار کرتے ہیں۔ میڈیا میں نصیرآباد کی خواتین کا ذکر ابھی جاری ہے کہ منجھوشوری کے علاقہ میں ایک اور انسانیت سوز واقعہ پیش آیا ہے۔ وہاں کی ایک معمر خاتون مسمات سکینہ نے ڈیرہ مراد جمالی کی عدالت میں درخواست دائر کی ہے کہ دس روز قبل علاقہ کے ایک بااثر زمیندار نے موٹر سائیکل کی چوری کے الزام میں اس کے 20 سالہ بیٹے غلام حیدر کو اپنے بنگلہ پر بلا کر بدترین تشدد کا نشانہ بنایا۔ ایک ماں کی فریاد کے مطابق جب نوجوان نے کسی جرم کا اعتراف نہ کیا تو مشتعل زمیندار نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے نوجوان پر شدید تشدد کر کے غلام حیدر کی زندگی کا دیا بجھا دیا۔ بوڑھی والدہ نے بتایا کہ مقامی پولیس بھی جانبدار ہے جو ملزمان کی نشاندہی کے باوجود کیس درج کرنے کو تیار نہیں جبکہ زمیندار نے نوجوان کی لاش بھی گم کردی ہے اور بوڑھے والدین کے گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کردی ہے۔ اس واقعہ کے بعد خواتین حقوق کی علمبردار بتائیں کہ یہاں جب مرد سے بھی اس طرح پیش آیا جائے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں تماشائی ہوں تو پھر کیا کیا جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظالم صرف ظالم ہوتا ہے اور اپنے

چھوٹے چھوٹے مفادات اور جھوٹی انا کی تسکین کے لئے بغیر کسی رنگ' قبیلہ' قوم اور جنس کے خود سے کمزور لوگوں کو ظلم کا شکار بناتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمیں کسی خاص گروہ کے بجائے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنی چاہئے۔ ظلم وتشدد مرد پر ہو یا عورت پر' ہندو پر ہو یا مسلمان پر وہ غلط ہے اور غلط کام کے خاتمے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ ایسے قبیح رواج کسی بھی معاشرے کی اجتماعی روایات نہیں بنتے بلکہ کچھ علاقوں میں چند افراد اپنے نام نہاد تعارف کا بھرم رکھنے کیلئے ہر عمل کو روایات کا نام دیتے ہیں جسے غلط ثابت کرنے کیلئے باشعور افراد کو اپنا کردار نبھانا ہوگا۔ جس طرح ایک ظالم کے پاس ظلم کرنے کیلئے کوئی تفریق نہیں، ہمیں بھی اسی طرح مظلوموں کی حمایت کیلئے ہر طرح کی لکیر مٹانی ہوگی۔ مظلوم کی تشخیص میں اگر ہم نے جنس، قوم اور رنگ کا فرق ختم کر دیا تو پھر مشترکہ جدوجہد سے ظالموں کے دائرے تنگ ہو جائیں گے کیونکہ وہ تعداد میں جو بھی ہوں لیکن ہم اکثریتی عوام ہیں۔

(23 ستمبر، 2008ء)

میٹھی عید میں زہر جیسی زندگی

عید کے لفظی معنی خوشی کے ہیں اور عیدالفطر کو میٹھی عید بھی کہا جاتا ہے۔ مگر بلوچستان میں ایک طویل عرصے سے جاری آپریشن کی وجہ سے صوبہ بھر میں سوگ کا سماں ہے اور ابھی عید سے چند روز قبل تک بلوچوں کے گدانوں سے بارود کی بو اٹھتی رہی ہے۔ اس لئے گولیوں کی اس گونج میں بلوچ اپنے پیاروں کی لاشیں جمع کر رہے ہیں جبکہ پوری دنیا عیدالفطر کا تہوار منا رہی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تو اس عید سے قبل ایک ماہ یعنی پورے تیس روز روزے رکھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اب تو سحر و افطار محض ایک نمائش ہے۔ مگر اسلام کے بنیادی فلسفے کے مطابق روزے اس وقت فرض کئے گئے جب ایک طرف پورے عرب میں خوراک کی کمی اور بھوک و افلاس کا دور دورہ تھا تو دوسری طرف وسائل و سہولیات پر صرف چند خاندان قابض تھے۔ روزے فرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تینوں اوقات پیٹ بھر کر کھانے والے جب ایک وقت کھانے سے پرہیز کریں گے تو انہیں فاقہ زدہ لوگوں کی بھوک کا احساس ہوگا اور خوراک کے بحران پر بھی قابو پایا جاسکے گا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ مذہب کی بنیادی فلاسفی میں صرف بھوکا رہنے کو روزہ نہیں کہتے بلکہ آنکھ، کان اور زبان کا بھی روزہ ہوتا ہے یعنی کہ یہ تینوں چیزیں کسی دوسرے کی برائی کے لئے استعمال نہ ہوں۔ اب اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد روزے کی رسم تو جاری ہے مگر یہ مذہب کے بنیادی فلسفے سے عاری ہے۔ محض اپنی خوشحالی کی نمود و نمائش کی خاطر روزہ تو رکھا جاتا ہے لیکن افسوس کہ آج بھی لاکھوں مسلمان خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ دنیا میں تیل کی پیداوار میں نصف سے زائد کے مالک امیر ترین مسلم ممالک ہونے کے باوجود کئی مسلم ممالک غربت کی لکیر سے بھی نیچے کی سطح پر ہیں۔ جہاں انسان شب و روز کی کوشش کے باوجود پیٹ بھر کر کھانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ امیر ممالک میں تو ہر روز جشن ہوتا ہے، عید ہوتی ہے مگر غریب ممالک کے لوگ تو سال میں ایک مرتبہ بھی خوشی منانے سے محروم ہوتے ہیں۔ ان

ممالک میں پہلے صرف غربت' بھوک وافلاس سے لوگ موت کا شکار ہوتے تھے مگر اب تو بالادست قومیں اور طبقے اکثریتی لوگوں کے وسائل ہڑپ کرجانے کے بعد ان کی کمزور آواز کو طاقت کے زور پر دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر فصلوں کے بجائے ہتھیار اُگتے ہیں اور بارش کے بجائے گولیاں برستی ہیں۔ ایسے میں صرف سروں کی کٹائی ہوتی ہے اور لاشیں گرتی ہیں اور عید کی خوشیاں اس دیس سے بہت دُور چلی جاتی ہیں۔

بلوچ سماج میں متوسط طبقے سے بھی بہت نیچے کی سطح کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ ہماری آبادی کی اکثریت عید کا انتظار صرف اس لئے کرتی ہے کہ پورے خاندان کیلئے سال بھر میں صرف ایک مرتبہ نئے کپڑے بنانے کا موقع ملتا ہے لیکن اب کچھ برسوں سے بارود کے ڈھیر پر مقیم باشندے اس معمولی خوشی سے بھی محروم ہو چلے ہیں۔ ذرا سوچیں معدنی وسائل سے مالا مال زمینوں کے مالک جب اپنی ملکیت غیروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوئے ہوں اور اپنی سرزمین پر مہاجروں جیسی زندگی بسر کررہے ہوں تو اس دربدری میں عید کی خوشیاں کہاں یاد رہتی ہیں۔ ویسے بھی عید صرف کپڑے بدلنے کا نام نہیں، یہ ایک خوشی ہے جو چیزوں کی خریداری سے نہیں بلکہ اندر کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ احساس تب جنم لیتا ہے جب آپ کے پیروں تلے اپنی زمین کھسکنے اور آپ کی چھت کا سایہ چھن جانے کا خوف نہ ہو۔ تحفظ وسلامتی کے بے خوف لمحے خوشیوں کا استقبال کرتے ہیں۔ ہماری دہلیز تو اب ان خوشیوں سے بہت دُور ہے۔

زمانۂ بچپن میں ہم بھی خوشیوں سے بیزار اِن رسومات کو فضول قرار دے کر پورا دن کمرۂ تنہائی میں بستر پر سوتے گزار دیتے تھے۔ پھر جب ہمارے اندر احساسات وشعور کا میدان جنگ بنا تو یہ لڑائی شعور نے جیت لی۔ ہمارا دل دلائل کے ہاتھوں مات کھا گیا کیونکہ ہم اجتماعیت کے دعویدار تھے تو شعور نے کہا کہ پھر اپنی ذاتی انا و تسکین کی خاطر اوروں کی خوشیاں کیوں خراب کرتے ہو، غریب و مسکین لوگوں کے دکھ وغم میں تو کوئی شریک نہیں ہوتا، اگر انہیں خوشی کا کوئی موقع ملتا ہے تو تم انہیں کیوں تنہا کرتے ہو۔ پھر جب ہم پہلی مرتبہ عید گاہ پہنچے تھے تو دیکھا کہ ایک رسم ہی سہی لیکن سب لوگ اپنا بھرم رکھنے کیلئے چند لمحے چہروں پر مسکراہٹ سجائے ہوئے ہیں اور کسی تعارف وجان پہچان کے بغیر ہر شخص بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کو عید مبارک کہہ رہا ہے، تو ہم نے سوچا کہ ایسا کرنے سے اگر کسی کو چند ساعتوں کی خوشی ملتی ہے تو ہمیں کیا تکلیف ہے۔ بس یہی سوچ تا حال ہم پر حاوی ہے کہ اگر کسی کے دکھ کم نہیں کر سکتے تو خوشیوں میں بھی خلل

نہیں ڈالنا چاہئے۔

ہمیں احساس ہے کہ آج وسیع وعریض بلوچستان میں عید منانے والوں کی تعداد بہت قلیل ہوگی لیکن جو بھی خاندان آج اپنے بچوں کے ساتھ عید منا رہا ہے تو ایک لمحے کیلئے انہیں ان بچوں کا بھی سوچنا چاہئے جو آج بھی پھٹے پرانے کپڑوں میں گند کے ڈھیر سے اپنی خوراک تلاش کر رہے ہوں گے۔ آج جب چند خاندانوں کی خواتین رسم عید ادا کریں تو انہیں ان خواتین کا خیال ضرور کرنا چاہئے جو آج بھی سنگینوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہیں، اور جب نوجوان نئے فیشن کے لباس زیب تن کریں تو ان ہزاروں لاپتہ نوجوانوں کو ضرور یاد رکھیں جن کی زندگی سوالیہ نشان ہے اور آج کی میٹھی عید منانے والے یہ نہ بھولیں کہ بلوچستان کی نصف آبادی کے گھروں میں سیکڑوں سقراط زندگی کے زہر کا پیالہ نوش کر رہے ہیں۔ اس لئے ان حالات میں عید کو سوگ قرار دینا کافی نہیں' احتجاج' مظاہرے جلسے جلوس سب ٹھیک مگر جب تک یہ احساس اندر سے نہ اٹھے گا ہم اس درد کی شراکت داری نہ کر سکیں گے۔ آج لازم ہے کہ ہم اپنی خوشیاں ان دردمندوں سے منسوب کریں جن کی تکلیف کی تاریں ہماری روح سے جڑی ہیں۔

(30 ستمبر،2008ء)

بلوچوں کی برداشت کا ایک اور امتحان

میڈیا ایک طوفان ہے یا سیلاب؛ جو بھی ہے مگر ایک دن وہ اخلاقیات' قانون' ادب احترام' رسم ورواج کو نیست ونابود کردے گا اور نام نہاد قومی چینلز کے نیم حکیم جیسے دانشوروں کی ترغیب پر جو معاشرہ تشکیل پائے گا وہ مذکورہ تمام اجزا سے آزاد ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میڈیا اکثریتی عوام کے ذہنوں پہ فوری اثر چھوڑتا ہے اس لئے جب ضیاالحق کے طویل مارشل لاء میں تمام سیاسی مزاحمتی تحریکوں کا مرکز سندھ تھا تو ایک سازش کے تحت پی ٹی وی سے ایسے ڈرامے نشر کیئے گئے جن میں سندھوں کو جاہل' وحشی اور ڈاکو کے روپ میں پیش کیا گیا، اس طرح دنیا بھر میں سیاست کے امام سندھ کا تعارف منفی ہونے لگا اور ایک باشعور مزاحمتی تحریک دنیا میں اپنا مطلوبہ مقام وتوجہ حاصل نہ کرسکی۔ یہی رویہ آج کل بلوچستان سے روا رکھا جارہا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جب سندھ میڈیا کا نشانہ بنا تھا تو عوام تک رسائی کا ذریعہ صرف سرکاری ٹی وی تھا اور اب جس طرح بلوچستان کے دشمنوں کی فہرست طویل ہے تو میڈیا میں بھی ان کی کمی نہیں ہے۔

بلوچستان میں ایک عرصے سے فوجی آپریشن جاری ہے۔ صوبے کی پسماندگی ختم کرنے کیلئے روڈ رستوں، تعلیم، ترقی کے بجائے چھاؤنیاں تعمیر ہورہی ہیں' سیکورٹی فورسز کے ہاتھوں ہر روز مرد وخواتین اپنی زندگیاں کھورہے ہیں۔ ہزاروں نوجوان لاپتہ ہیں، آپریشن سے متاثرہ ہزاروں خاندان نقل مکانی کرکے کھلے آسمان تلے بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں مگر یہ سب چینلز کے سیاسی چارٹ کا حصہ نہیں بنتے۔ لیکن اگر کہیں کوئی سماجی جرم ہوجاتا ہے تو اسے یوں پیش کیا جاتا ہے جیسے پورا بلوچستان ٹریکٹروں پر سوار ہو کر خواتین کو زندہ درگور کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ نصیر آباد کے ابھی ایک ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا ہی نہیں تھا کہ پھر ہانگ کانگ کی انسانی حقوق کی تنظیم پر انکشاف ہوا ہے کہ ان خواتین کو زندہ درگور کرنے پر احتجاج کرنے کے جرم میں اسی قبیلے کے مزید تین خواتین کو بھی زندہ درگور کیا گیا ہے۔ اس واقعے کے بعد تو

ایسا لگتا ہے کہ نصیر آباد ایک نوگو ایریا کا نام ہے جہاں سول سوسائٹی، قانون، سیاسی جماعتیں، باشعور حلقوں کا کوئی نام نہیں، بس جنگل کا قانون ہے، جب جی چاہا خواتین کو پکڑ کر زندہ دفنا دیا حالانکہ اس دوران سندھ میں کاروکاری کے متعدد واقعات ہوئے ہیں، پنجاب میں ونی رسم کے تحت معصوم بچیوں کی زندگی کا دان دیا گیا ہے، سرحد میں خواتین کی خرید وفروخت ہوتی رہی ہے مگر نام نہاد قومی میڈیا باقی تینوں صوبوں کے سیاسی وقومی مسائل اجاگر کر کے ان پر بحث ومباحثے کرتا ہے جبکہ بلوچستان کے لئے ان کا رویہ بالکل مختلف رہا ہے۔ یہاں میڈیا کو تنقید کا نشانہ بنانے کا مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے ہاں سب کچھ درست ہو رہا ہے لیکن غلطیوں کی غلط تشہیر سے معاشرے کو ترغیب ملتی ہے اور وہ معاشرہ جہاں تعلیم کی شرح انتہائی نچلی سطح پر ہو تو بعض اچھائی کی چیزیں بھی اپنا منفی اثر چھوڑتی ہیں۔

جدید دنیا میں میڈیا بھی ایران کے جوہری پروگرام کے مترادف ہے، جسے پہلے پوری دنیا نے قبول کیا لیکن اب اس کی افزودگی سے سب خوفزدہ ہیں۔ طاقت کسی بھی صورت میں ہو اس کا غلط استعمال غلط نتائج ہی دے گا اور میڈیا میں یہی ہو رہا ہے۔ اسلام کی ہواؤں میں سازشوں کے جال بچھائے متعصب اردو میڈیا میں اس وقت بلوچستان کا جو نقشہ پیش کیا جا رہا ہے، اس سے این جی اوز کی دکان تو چمک سکتی ہے مگر شاندار تہذیب وثقافت کی مالک بلوچ قوم پر یہ ایک ایسا بے وقت کا حملہ ہے کہ جدید میڈیا کی سہولت سے محروم نہتے بلوچ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ کاش کہ بلوچوں کے پاس ایک بہترین ٹی وی چینل ہوتا جس کی نشریات اسلام آباد سمیت دنیا بھر دیکھی جاتیں تو آج ہم ان حملہ آوروں کو بتا دیتے کہ محبتوں کی مٹی سے گندھے مہر گڑھ کی تہذیب کے وارث بلوچ، وحشی اور جاہل نہیں ہیں۔ بلوچستان کی شاندار قبائلی روایات میں سب سے اعلیٰ ومحترم مقام عورت کا ہی ہے۔ نصیر آباد میں جن واقعات کا ذکر ہو رہا ہے پہلے تو وہ اس طرح ہوئے ہی نہیں جیسے بیان کئے جا رہے ہیں اور اس علاقے میں ان جاگیرداروں کا قبضہ ہے جنہیں ہمیشہ ریاست و نام نہاد قومی میڈیا نے پناہ دے کر کاغذی شیر بنایا ہے۔ ان معمولی واقعات کو بنیاد بنا کر جس طرح بلوچ سماج پر میڈیائی دانشوروں کے ذہنوں کا گند اچھالا جا رہا ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاستی ادارے میڈیا کا سہارا لے کر بلوچ قومی تحریک کا رخ موڑنا چاہتے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے غیر ضروری مسائل کی طرف عوام کو متوجہ کر کے اصل جدوجہد سے گمراہ کرنے کی اس سازش کا مقابلہ کرنے کیلئے باشعور افراد کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ بلوچ وطن دوست اخبارات اگر بلوچ کیس لڑ بھی رہے ہیں تو ان کی محدود اشاعت کے باعث ملک کے دیگر حصوں میں ان کی رسائی ممکن نہیں اس لئے ہم اپنے دکھ لکھ کر خود ہی

پڑھتے ہیں اور خود ہی روتے ہیں۔ اگر ہمارا کیس، ہمارا موقف کہیں نہیں سنا جاتا تو اپنی رسوائی اور تذلیل سے بھرپور تبصرے ہم کیوں سنیں! بلوچ عوام کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ جو چینل ہمیں سنے بغیر ہمارے حقائق کے منافی کچھ پیش کرے تو بائیکاٹ کا حق ہم ضرور استعمال کریں اور ان کو مجبور کریں کہ بلوچ معاشرے کے حساس موضوعات پر عوام کے اصل نمائندوں کو بھی شریک گفتگو کیا جائے۔ بلوچ اکثریتی عوام کو میڈیا کی اس جنگ میں اپنی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے عمل و کردار سے ثابت قدم رہنا ہوگا۔

(7اکتوبر،2008ء)

پارلیمنٹ کی مضبوطی، بالادست کی مضبوطی ہے

اس ملک کے قیام سے اب تک یہ طے نہیں ہو پایا کہ یہاں نظامِ حکومت کون سا رائج ہونا چاہئے۔ بھارت سے علیحدگی کے فوراً بعد محمد علی جناح گورنر جنرل بن گئے، پھر صدر کا عہدہ مسلط کیا گیا۔ بعدازاں عوام کو طاقت کا سرچشمہ کہنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے تمام سیاستدانوں کو بٹھا کر 1973ء کا آئین تشکیل دیا تو یہ طے ہوا کہ اب اس ملک میں پارلیمانی نظام نافذ ہوگا۔ پارلیمنٹ سب سے سپریم ادارہ اور وزیراعظم بااختیار سربراہ ہوں گے۔ مگر یہ باتیں اپنے وجود سے ہی صرف آئین کی تحریر میں مقید ہوکر رہ گئیں۔ وہ آئین جسے جنرل ضیا نے کاغذ کا ٹکڑا کہہ کر ہوا میں لہرادیا تھا اور جس ملک کا آئین ہواؤں میں لہرانے لگے۔ وہاں غیر آئینی حکمرانوں کے قدم مزید پختہ ہوجاتے ہیں، اس لئے ہمارے ہاں آئین کی حکمرانی کم ہی رہی ہے۔ ماضی میں ذوالفقار علی بھٹو کی دعوت پر پورے ملک کے تمام سیاسی رہنماؤں نے متفقہ آئین بنایا تھا، اسے قابض غیر آئینی حکمرانوں نے اپنی سہولت و مرضی کے مطابق تبدیل کیا۔ یہ سلسلہ ماضی قریب کے آمر پرویز مشرف تک چلتا رہا۔ مشرف کے قافلے میں آئینی مشیروں کی بڑی فوج شامل تھی، اس لئے آئین میں ترامیم کے ذریعے وہ اپنے تمام غیر قانونی' غیر آئینی و غیر اخلاقی اقدام کو آئینی بناتا رہا۔ مگر اٹھاون ٹو بی کا سلسلہ بہت پرانا ہے جس کا شکار مختلف جمہوری حکومتیں ہوچکی ہیں۔ اب جب پورے ملک میں اپنے اتحادیوں کے تعاون سے پیپلز پارٹی حکومت قائم کرچکی ہے اور ایوان صدر میں پارٹی کے شریک چیئرمین اپنی حکمت و طاقت سے داخل ہوچکے ہیں تو ملک بھر کے سیاسی حلقوں میں دوبارہ اس بحث کا آغاز ہوچکا ہے کہ ایوان صدر کو اپنے اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل کرنا چاہئیں۔ یہاں تک کہ تمام اختیارات پرویز مشرف کے قدموں میں رکھنے والی جماعت ق لیگ کو بھی اب ایوان صدر سے جمہوری عمل وفیصلوں کی امید ہے۔

بلوچ عوام کی اکثریت کی حمایت یافتہ سیاسی جماعتوں نے عام انتخابات سے بائیکاٹ کر کے پارلیمانی سیاست سے قطع تعلق کا اظہار کردیا تھا مگر کچھ دنوں سے سیاسی فضاؤں میں یہ باتیں بھی گردش کرنے لگی ہیں کہ بلوچوں کیلئے پارلیمنٹ میں ہونا بھی ضروری ہے، یعنی ایوانوں میں اور پہاڑوں پر دونوں اطراف جنگ لازم ہے۔ ابھی اس خیال پر بحث کے کئی پہلو سامنے آنا باقی تھے کہ بلوچ ریپبلکن پارٹی کے کونسل سیشن میں ٹیلی فونک خطاب کرتے ہوئے نوابزادہ براہمدغ بگٹی نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ پارلیمانی سیاست میں ہم تلخ تجربات کر چکے ہیں اس لئے اب بلوچ مسئلے کا حل پارلیمنٹ میں ممکن نہیں۔

پاکستان کے موجودہ نظام حکومت اوراس کے اداروں سے مایوسی آج کی بات نہیں، اس کی بنیاد ظلم وزیادتیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس لئے بلوچ عوام اب صوبائی خودمختاری کو بھی ناکافی سمجھتے ہیں۔ براہمدغ نے پارلیمنٹ سے متعلق واضح کہا ہے کہ ایک ایسا ادارہ جہاں بالادست صوبے کی اکثریت موجود ہو وہاں دیگر قومیتوں کے حق میں فیصلوں کی امید فضول ہے اور اگر جمہوری حکومت پارلیمنٹ کی مضبوطی کی بات کرتی ہے تو حکمرانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ عددی اعتبار سے پارلیمنٹ میں ایک صوبے کی اکثریت ہے، اس لئے پارلیمنٹ کی مضبوطی کا مقصد دوسرے الفاظ میں بالادست صوبے کی حیثیت کو مستحکم کرنا ہے۔ اس صورتحال میں تمام سیاسی جماعتوں کو اپنے مطالبے پر نظرثانی کرنا ہوگی کہ پارلیمنٹ کی مضبوطی سے دیگر تین صوبوں کی محرومیوں میں اضافہ ہوگا اور ایوان ناانصافی وزیادتی بھرے فیصلوں کا مسکن ہوجائے گا۔ ویسے بھی پارلیمنٹ ایک متنازعہ ادارہ ہے جہاں فیصلے رائے شماری سے ہوتے ہیں، جب تمام قوموں کی نمائندگی یکساں نہیں ہوگی تو فیصلوں میں انصاف کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ جہاں ایک ایسے صوبے کی عددی اکثریت ہے جو پاکستان کو صرف اپنی جغرافیائی سرحدوں تک محدود سمجھتا ہے اور باقی تمام صوبے بالادست صوبے کی نظر میں غدار ہیں۔ ایسے متعصبانہ ماحول میں مظلوم ومحروم صوبوں کی اخلاقی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ اس لئے جمہوری حکومت اور تمام سیاسی جماعتوں کو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ پارلیمنٹ کی مضبوطی دراصل ایک صوبے کی مضبوطی ہے اور اختیارات کی منتقلی کا سوال محکوم قوموں کے سامنے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر جمہوری حکومت ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ کر مظلوم ومحکوم صوبوں کی شکایات کا ازالہ کرنے میں واقعی مخلص ہے تو پارلیمنٹ کی تشکیل نو کر کے تمام صوبوں کو یکساں نمائندگی دینا ہوگی۔ بصورتِ دیگر موجودہ پارلیمنٹ کی مضبوطی سے چھوٹے صوبوں کی شکایات ومحرومیوں میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔

(14 اکتوبر، 2008ء)

مستقبل کا تحفظ، معلم کے تحفظ سے مشروط ہے

کسی بھی معاشرے کی پسماندگی کے بنیادی اسباب میں سب سے اہم تعلیم کو سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کسی بھی قافلے کو منزل تک پہنچانے کیلیئے رستے طے کرتی ہے اور کئی رستوں میں سے درست سمت کے انتخاب کا شعور بھی تعلیم ہی فراہم کرتی ہے۔ تعلیم ہی کسی بھی قوم کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ جن اقوام نے جنگ وجدل کے بجائے حصول تعلیم کو رستہ اپنایا، انہوں نے پوری دنیا کی رہنمائی کی۔ مگر اس رہنمائی، ترقی علم وعقل اور شعور کے پیچھے ایک گمنام کردار ہوتا ہے جسے معاشرہ استاد کے نام سے جانتا ہے۔

فرش سے عرش تک پہنچانے والے استاد کی شخصیت کی گہرائی کو بعد میں دیکھتے ہیں۔ پہلے ہم ذکر کریں گے عالمی بیماریوں میں مبتلا اس معاشرے کا جہاں تمام رشتوں ناطوں کے نام سے مختلف دن منسوب کر کے اپنی ذمہ داری پوری کی جارہی ہے۔ اس بیمار سوچ کے مطابق گزشتہ دنوں استاد کا عالمی دن منایا گیا۔ جس استاد کی شفقت سے اس کے شاگرد مختلف اعلیٰ عہدوں تک پہنچ جاتے ہیں مگر وہ استاد بیچارا زندگی کی آخری سانس تک سائیکل پر ہی سوار رہتا ہے۔ قوم کے مستقبل کو محفوظ کرنے کیلیئے اس ذہن ساز شخصیت کی عقیدت واحترام میں سال کے پورے دن بھی کم پڑ جاتے ہیں، مگر ہم تو لکیر کے فقیر کی مانند بلا سوچے سمجھے بس غیروں کی کھینچی ہوئی لکیر پر چلنے کو ہی فخر سمجھتے ہیں۔ اس لئے استاد کا عالمی دن بھی ہم نے محض نمائش کیلیئے منایا۔ کسی طالب علم نے اپنے کسی بہترین استاد کے پاس جا کر اسے خراجِ تحسین پیش نہیں کیا ہوگا، نہ ہی اس روز کسی استاد کی زندگی میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی ہوگی۔ استاد آج بھی غربت وگمنامی کی زندگی بسر کرتا ہوگا۔

مگر ایسے اساتذہ کی تعداد موجودہ معاشرے میں بہت قلیل ہے جو اپنی تنخواہ پر گزارہ کر کے انتہائی خلوص سے اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں، وگرنہ آج کا جدید استاد تو ماسوائے پڑھانے کے باقی

تمام کام بخوبی کر لیتا ہے۔ غیر تدریسی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے باعث استاد معاشرے میں اپنا مقام کھوتا جا رہا ہے، جس کا تعارف بی بی سی کے وسعت اللہ خان نے اپنی تحریر میں بہت خوب کیا ہے کہ آج کل تعلیم ایک صنعت استاد مشینری اور طلبہ کرنسی نوٹ میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ایسی دلچسپ اور خوبصورت تشریح کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی آج کا استاد اپنی اصل شکل میں کہیں موجود ہے!

آج سے بیس پچیس قبل اساتذہ حرص ولالچ کے فوائد برکات ورحمتوں سے ناواقف تھے جس کے باعث عام سرکاری اسکولوں میں بھی خالص معیاری تعلیم دی جاتی تھی اور جب اپنے اعلیٰ اقدار کے ساتھ زنگ زدہ سائیکل پر کوئی استاد کسی راہ سے گزرتا تھا تو وہاں موجود تمام لوگ اس طرح احترام سے سلام کرتے تھے جیسے کوئی شاہی سواری گزر رہی ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب والدین اپنے بچوں کو لے کر اسکول پہنچتے تھے اور اپنے بچے کا ہاتھ استاد کے ہاتھ میں تھماتے تھے جس پر استاد کہتا تھا کہ جناب آپ بے فکر ہو جائیں، اب یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اس زمانے میں اشاعت کے تجارتی اداروں کا ابھی داخلہ نہیں ہوا تھا اور معصوم طالب علم بھاری کتابوں کے بوجھ تلے نہیں آیا تھا۔ ذہنی طور پر سست اور پڑھائی میں کمزور بچوں کو استاد بلا معاوضہ اپنا اضافی وقت دیتے تھے اور جب کوئی طالبعلم انجینئر، ڈاکٹر سمیت کوئی بھی اعلیٰ امتحان پاس کر کے کسی مقام پر پہنچتا تھا تو اپنے والدین اور عزیز واقارب سے بھی پہلے اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ان دنوں کسی استاد کو تنخواہ یا قرض حاصل کرنے کیلئے پولیس کی لاٹھیاں اور بینک افسران کا ہتک آمیز رویہ برداشت نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اساتذہ کی بھرتی سے لے کر تعیناتی تک کبھی کسی وزیر، ایم پی اے یا ایم این اے کی مداخلت نہیں ہوتی تھی۔ تب تک ہمارے ادارے بہترین طالبعلم پیدا کرنے کے کارخانے تھے۔ اس صدی کے تمام بڑے نام انہی استادوں کے تربیت یافتہ تھے۔

پھر اچانک ایسی ہوا چلی کہ اساتذہ کو اپنے اضافی وقت کیلئے الگ رقم کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ نجی تعلیمی اداروں نے امیر وغریب کی لکیر کو گہرا کر دیا۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ ڈیوٹی پرائیویٹ اسکولوں میں دینے لگے۔ غریب عوام کے معصوم بچے استاد کے دیدار کو ترسنے لگے۔ امیروں کی اولاد نے اسکول ٹائم کے علاوہ بھی قابل اساتذہ کا وقت خرید کر ٹیوشن پڑھنا شروع کیا۔ پھر ٹیوشن سینٹروں کا پورے ملک میں بازار سج گیا۔ اساتذہ تدریس کے نرخنامے بنانے میں لگ گئے اور تعلیم ایک مکمل صنعت کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک استاد نے اپنا مقام تب کھونا شروع کیا جب ملک میں بیروزگاروں کی ایک فوج تیار ہو چکی تھی اور نوجوانوں کے پاس روزگار کی تلاش میں کوئی انتخاب نہ رہا تھا۔ اس بھیڑ میں سیاسی قیادت نے اپنے بنگلوں

کے خدمت گاروں کو بھی بھرتی کروالیا۔ یوں با اثر افراد کی پشت پناہی سے اساتذہ کی نشست پر بھرتی کئے گئے۔ لوگ گھر بیٹھے تنخواہ حاصل کرنے لگے اور سرکاری اسکول ویران ہونا شروع ہوئے۔ معاشی طور پر خوشحال افراد نے اپنے بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تو پرائیویٹ اسکولوں کا کاروبار شروع ہوا، جبکہ اکثریتی عوام کے بچے بغیر عمارت کے اسکول میں کھلے آسمان تلے تا حال استاد کا انتظار کر رہے ہیں۔ اوپر سے رہی سہی کثر اساتذہ یونین نے پوری کردی۔ مختلف ناموں کی شکل میں موجود اساتذہ یونین نے اساتذہ کے مفادات کے تحفظ کے نام پر بچوں کی تعلیم داؤ پر لگادی اور یونین میں سرگرم اساتذہ اپنے فرائض سے آزاد ہو گئے۔

ماضی میں جب اساتذہ کا کوئی دن نہیں منایا جاتا تھا، تب ہر دن اساتذہ کا ہوتا تھا اور لوگ اپنی محبت، عقیدت و احترام اساتذہ سے منسوب کرتے تھے۔ آج پھر پورے معاشرے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اساتذہ کا وہ کھویا ہوا مقام واپس دلایا جائے۔ اس کے لئے اساتذہ کو بھی اپنے اسکولوں کی طرف لوٹ آنا ہوگا۔ قوم کے مستقبل کی رہنمائی کرنا ہوگی اور اساتذہ یونین کو بھی بائیکاٹ و تالہ بندی کی پالیسی تبدیل کرکے اسکول و تعلیم کے دائروں میں ہی اپنی جدوجہد کرنا چاہیے۔ اساتذہ کو چند پیسوں کی خاطر اپنے طالبعلموں میں پسند و ناپسند کی لکیر نہیں کھینچنا چاہئے بلکہ اپنے علم کو جدید تدریسی علم سے ہم آہنگ کرکے تمام طلبہ کو بلاتفریق ایسا درس دینا چاہئے کہ وہ مستقبل کے ذمہ دار انسان ثابت ہوسکیں۔ اس عمل میں والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تربیت میں استاد کے مقام و اہمیت کو اجاگر کریں، اور سب سے اہم کام حکومتِ وقت کا ہے کہ اساتذہ کی بھرتیوں میں سیاسی وفاداری کے بجائے میرٹ کو ترجیح دیں اور معیاری تعلیم کیلئے اساتذہ کی مراعات و تعلیمی اداروں کی سہولیات میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے تاکہ اساتذہ اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کی تلاش میں پرائیویٹ اداروں کے جال میں نہ پھنس سکیں۔

یہی ایک بہترین طریقہ ہے اساتذہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کیلئے۔ باقی ہر سال 5 اکتوبر کو دھواں دھار تقاریر کی بوچھاڑ سے استاد کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اگر ہمیں اپنے مستقبل کو محفوظ کرنا ہے تو معلم کے مفادات کا تحفظ کرنا ہوگا۔ اپنے اساتذہ کو جدید علوم سے آشنا کرکے انہیں اس قابل بنا ہوگا کہ ان کی علمی قابلیت و اہمیت کو سلام پیش کرنے کیلئے کسی مخصوص دن کا انتظار نہ کرنا پڑے بلکہ ہر دن اساتذہ کی صلاحیتوں کے اعتراف کا دن ہو۔

(20 اکتوبر، 2008ء)

فاقہ زدہ عوام کا یومِ خوراک

انسانی زندگی کیلئے مکمل غذا کی موجودگی لازم ہے۔گذشتہ روز جب خوراک کا عالمی دن منایا گیا تو ایسے میں ملک بھر میں عوام کو شدید غذائی بحران کا سامنا ہے۔ یہ بحران ایک طویل عرصے سے جاری ہے جس کے لئے ماہرین کا کہنا ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے یہ مصنوعی بحران پیدا کیا ہے۔ وفاقی صوبائی محکمہ خوراک کی وزارت نے بھی بحران کو مسترد کیا ہے،لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں۔

خوراک کا عالمی دن تو پہلی مرتبہ 1979ء میں منایا گیا مگر ہر سال ایک خاص وقت میں غذائی بحران کا یہ سلسلہ پرانا ہے۔ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا میں ایک ارب کے قریب لوگ بغیر کچھ کھائے خالی پیٹ سوجاتے ہیں اور پاکستان میں غذائی قلت کے شکار لوگوں کی تعداد 7 کروڑ 70 لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔گندم کا یہ بحران گزشتہ سال بھی ہوا تھا اور حکومت وقت کی جانب سے 5 لاکھ ٹن گندم برآمد کرنے کے باعث آٹے کا بحران خوفناک شکل اختیار کر گیا تھا، اب یہ بحران مزید بدترین شکل میں موجود ہے۔جدید اخلاقیات اور اعلیٰ معیارِ زندگی کی دعویدار دنیا اس وقت بھی اسلحے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ دنیا کے کئی ترقی یافتہ ممالک اپنے بجٹ کا کثیر حصہ اسلحے کی خریداری پر خرچ کرتے ہیں جبکہ اس کے باعث نہ صرف عام انسان کے رہن سہن میں فرق ہوا بلکہ غربت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ لوگوں کو دو وقت کی روٹی ملنا بھی مشکل ہوگئی ۔یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر مناسب خوراک نہ ملنے کے باعث روزانہ 24 ہزار افراد ہلاک ہورہے ہیں، جن میں 16 ہزار صرف بچے ہیں ،یعنی کہ اوسطاً ہر سیکنڈ میں ایک بچہ خوراک کی عدم دستیابی کا نشانہ بن رہا ہے۔اعلیٰ اقدار کی اس دنیا میں آج بھی 85 کروڑ 40 لاکھ افراد غذا کی قلت کا شکار ہیں، جن کا 96 فیصد یعنی 82 کروڑ افراد کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہے۔یوں ترقی پذیر ممالک کا ہر چھٹا فرد غذائی قلت کا شکار ہے۔

پاکستان کی ہر حکومت غربت مٹانے کی بات تو کرتی ہے مگر منصوبوں پر عملدرآمد کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو غریب کو مٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ملک میں تو اب ایک منتخب جمہوری حکومت کا قیام ہو چکا ہے اور حکمران جماعت کی بنیاد روٹی کپڑا اور مکان پر رکھی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان میں غذائی قلت کے شکار افراد کی تعداد میں 28 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کی صورتحال بھی ایتھوپیا کے قریب تر ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر حقائق کے برعکس ڈرامے اور فلمیں دکھانے سے عوام کی زندگی تبدیل نہیں ہو جاتی۔

ملک میں تیل وڈیزل کی قیمتوں اور بجلی کے نرخوں میں اضافے کے باعث زراعت کے شعبے میں زیر استعمال اجناس کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوا جس سے بدحالی کے شکار کسان کے مسائل میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن ہمارے حکمران اگر بہتر حکمتِ عملی کا استعمال کرتے تو آج عوام فاقوں میں مبتلا نہ ہوتے، کیونکہ گزشتہ برس گندم کی اچھی فصل کے باعث 5 لاکھ ٹن گندم دوسرے ممالک برآمد کی گئی۔ کمیشن مافیا حکمرانوں کے اس عمل سے پورے ملک میں نہ صرف گندم کی قلت ہوئی بلکہ جنوری 2007ء سے جنوری 2008ء تک ایک سال کے دوران فی کلو گندم کی قیمت میں 15 سے 25 روپے تک اضافہ ہوا۔ حکمرانوں کی دیکھا دیکھی میں ذخیرہ اندزوں اور اسمگلروں کو بھی راستہ صاف نظر آیا تو بلوچستان سے افغانستان گندم اسمگلنگ کے باعث نہ صرف یہ بحران شدت اختیار کر چکا ہے بلکہ اب تو عام شہری کیلئے دو وقت کی روٹی کھانا بھی ممکن نہیں رہا۔ خوراک سے محروم ایسے افراد کی تعداد میں 5 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ 3 کروڑ 75 لاکھ افرد کو مناسب خوراک نہیں ملتی۔ خوراک کے عالمی دن پر بھی لوگ آٹے کے حصول کیلئے قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ صوبائی وزراء صرف تصویر بنوانے کیلئے آٹا کی تقسیم کرتے ہیں تو پولیس اہلکاران بھوکے لوگوں پر لاٹھیاں برساتے ہیں۔

یہی صورتحال ہے جس کی رپورٹ میں عالمی ادارے بتاتے ہیں کہ دنیا کا ہر چوتھا بچہ غذائی قلت کا شکار ہے۔ 15 کروڑ بچے جو کہ بچوں کی کل تعداد کا 26 فیصد ہیں کم وزنی کا شکار ہیں جبکہ 32 فیصد یعنی 18 کروڑ 20 لاکھ ایسے بچے ہیں جن کی نشوونما غذائی قلت کے پاس رک گئی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں ہر سال 2 کروڑ سے زائد پیدا ہونیوالے بچے کم وزنی کا شکار ہو جاتے ہیں؛ وہ بچے جن کیلئے دانشوروں کا کہنا ہے کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں لیکن ہم وہ بدقسمت قوم ہیں جس کا ماضی حملہ آوروں نے برباد کیا، حال حکومت کی حکمت عملیوں کے حوالے ہے اور مستقبل غذائی قلت کا شکار ہونے جارہا ہے۔ جب کسی قوم

کا کوئی بھی زمانہ محفوظ نہ ہوتو عصر کے ذہنوں کو سر جوڑ کے بیٹھنا پڑتا ہے کیونکہ یہ فاقہ زدہ قوم اگر خوراک کا عالمی دن منا کر ان کے فاقوں کا مذاق اڑانے کے بجائے غذائی بحران سے نمٹنے کیلئے ایک ایسی پائیدار حکمت عملی مرتب کرنا ہوگی جس سے بغیر لاٹھی کھائے عوام کو آٹا فراہم ہوا اور لوگ سستا و معیاری آٹا با آسانی حاصل کر کے دو وقت کی روٹی آرام سے کھا سکیں اور آئندہ سال یومِ خوراک پر عوام کی اکثریت فاقوں سے محفوظ ہو۔

(22 اکتوبر، 2008ء)

بات تو سچ ہے مگر......

جب ہم سکول کے زمانے میں پڑھتے تھے، تب سے کشمیر کا ذکر سنتے اور پڑھتے آرہے ہیں۔ زمانہ لاشعور میں تو ہمیں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی اصطلاح بھی سمجھ نہیں آتی تھی پھر جب یہ سمجھ میں آیا کہ پاکستان و بھارت اپنے اپنے کنٹرول میں کیئے ہوئے کشمیر کو آزاد اور مخالف کی سرحدوں میں واقع کشمیر کو مقبوضہ کہتے ہیں تو اس مضحکہ خیز اصطلاح پر حیرانی بھی ہوتی تھی اور غصہ بھی آتا تھا۔ پھر کالج و یونیورسٹی کے زمانہ میں کشمیر ہمارے حلقوں میں ایک مذاق بنا رہا۔ اپنے دوستوں سے جو عہد پورا نہ کرنے کا ارادہ ہوتا تو کہتے کہ کشمیر کی آزادی تک یہ کام ہو جائے گا۔ اُن دنوں تو دکانداروں نے بھی اسٹیکر چسپاں کر رکھے تھے کہ 'کشمیر کی آزادی تک اُدھار بند ہے' جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تاعمر ادھار نہیں دینا، کیونکہ ہر عام و خاص یہ سمجھتا تھا کہ کشمیر کی آزادی ممکن ہی نہیں۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جسے ہر حاکمِ وقت نے اپنے مفاد کیلیئے استعمال کیا۔ کشمیر جیسی خوبصورت وادی کو دونوں ممالک نے تقسیم تو کر دیا پھر زیادہ کی لالچ میں تاحال ان کی خونی جنگ جاری ہے۔ کشمیر کے دونوں طرف چند ایسے مذہبی گروہ موجود ہیں جو اپنی اپنی پسند و سہولت کے مطابق ایک جنگ شروع کیئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اقوام متحدہ کی قرارداد میں یہ واضح تحریر ہے کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کی اکثریت کی رائے کے مطابق کیا جائے۔ لیکن یہاں کشمیر سے متعلق کشمیریوں سے کبھی نہیں پوچھا گیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ پس وہاں کے سیاسی، مذہبی گروہ اور دونوں ممالک کی حکومتیں کچھ عرصہ آرام کر کے پھر کشمیر کا راگ الاپنے شروع کر دیتی ہیں۔

کشمیر کبھی بھی اس ملک کے اکثریتی عوام کا دردِ سر نہیں رہا لیکن یہاں کی مذہبی جماعتوں نے کشمیر سے متعلق معاملات کو مذہبی رنگ دے کر اس قدر جذباتی بنا دیا ہے کہ اب ہر حکومت کشمیر پالیسی پر اپنے تحفظات ظاہر نہیں کرتی بلکہ سیاسی قیادت بھی کشمیر سے اپنی محبت کے اظہار کو لازم سمجھتی ہے۔ ویسے تو ظاہری طور پر جے یو آئی نے ہمیشہ طالبان اور افغانستان کی وکالت کرنے اور جماعتِ اسلامی کشمیر کا رونا روتے رہتے

ہیں، مگر پارلیمنٹ میں جماعت اسلامی کی نمائندگی نہ ہونے کے باعث کشمیر کمیٹی ہمیشہ مولانا فضل الرحمان کے حصے میں آتی ہے۔ اب اگر یہ صرف مسلمانوں سے ہمدردی ہوتی تو فلسطین سمیت دنیا کے کئی اسلامی ممالک ہیں جہاں مسلمان تکلیف زدہ زندگی بسر کر رہے ہیں مگر یہ بالادست صوبے کے مفادات کی جنگ ہے۔ وہ صوبہ جہاں سے پاکستان کی فوج کی اکثریت کا تعلق ہے۔ اس فوج کے سپاہیوں کو کچھ تو ایسی مصروفیت چاہئے کہ جس سے وہ اپنے دفاعی بجٹ کا دفاع کر سکیں۔ اس لئے باجوڑ اور بلوچستان میں بھی انہوں نے جنگ شروع کر رکھی ہے اور مسئلہ کشمیر تو اس فوج کا 'سیونگ اکاؤنٹ' ہے کہ جب ہر جگہ سے دیوالیہ ہو جائے تو کشمیر کا باب کھولا جائے۔ یہ عمل قیام پاکستان سے ہی جاری ہے۔ ہر حکمران نے فوج کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے کشمیر پالیسی کو تقویت دی ہے۔ فوج، حکومت اور بالادست صوبے نے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر ہماری شہ رگ ہے جسے حاصل کئے بغیر نہ صرف ملکی سالمیت بلکہ اسلام کو بھی خطرہ لاحق ہے۔ اس ملک کے حکمران وردی والے ایوب خان، ضیا الحق یا پرویز مشرف ہوں یا شیروانی والے ذوالفقار علی بھٹو، نواز شریف و بینظیر ہوں' کشمیر پالیسی پر ان کی سوئی آ کر اٹک جاتی تھی۔ کبھی کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ وہ یہ مطالبہ کریں کہ مسئلہ کشمیر کا حل اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق کیا جائے۔ حالانکہ افغانستان کی وجہ سے دنیا بھر کے الزامات کا سلسلہ تو اب شروع ہوا ہے جبکہ اس سے قبل کشمیر کے باعث ہمسایہ ملک بھارت نے پاکستان کو پوری دنیا میں رسوا کیا ہے۔ سرحدوں سے در اندازی اور دہشت گردی کو پناہ دینے کا الزام تو بہت پرانا ہے جسے یہاں کی مذہبی جماعتوں نے ہمیشہ اسلام دشمنی کہہ کر مسترد کر دیا ہے، جس کے باعث حکمران بھی خاموش رہے ہیں۔

مذہبی جماعتوں اور پاک فوج کے زیر اثر رہنے والی حکومتوں میں سے پہلی مرتبہ اس جمہوری حکومت کے صدر آصف علی زرداری نے کشمیری عسکریت پسندوں کو دہشت گرد کہا تو جیسے جنگل میں آگ لگا دی۔ سب کو فکر کھا گئی کہ اسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ ہر شخص نے اپنے اپنے طریقے سے اسلام کو بچانے کی ٹھان لی۔ عمران خان، نواز شریف، قاضی حسین احمد، فضل الرحمٰن کو اگر کچھ پریشانی ہوئی تو یہ بات قابلِ سمجھ تھی مگر جب کشمیر کے بارے میں ممتاز بھٹو اور تاج محمد جمالی جیسی شخصیات کو بھی فکر ہونے لگی تو عوام کو حیرانی ضرور ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ صدر زرداری کی بات سو فیصد درست تھی مگر اس بات کے حق میں ہماری وکالت کی تیاری تک صاحبِ کلام اپنی بات سے ہی دستبردار ہو گئے اور وضاحتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ویسے آصف زرداری کا نام آتے ہی کسی بھی بات کی پائیداری کا تصور فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ اسیری کا تمام عرصہ انہوں نے نہ جانے

کس طرح ثابت قدمی سے گزارا، باقی اپنے قول سے ہٹ جانا ان کے لئے عام سی بات ہے جس کے لئے وہ فرماتے ہیں کہ سیاسی بیان کوئی احادیث نہیں ہوتے۔ اس لئے صدر صاحب کے ہر بیان کے بعد عوام اس انتظار میں رہتی ہے کہ کب وہ اپنی بات کو سیاسی بیان قرار دیتے ہیں۔ مطلب کہ ان کی نظر میں غلط بیانی کو سیاسی بیان کہا جاتا ہے۔ مملکت کے ایک ذمہ دار عہدیدار کی جانب سے قوم کو جیسے مشکل وقت میں غلط بیانی کی ترغیب دی جارہی ہے۔ صدر زرداری نے عہدہ قبول کرنے سے قبل جو کچھ کیا اور کہا، قوم نے اسے فراموش کر دیا۔ مگر کشمیر کے بارے میں کہی ہوئی بات پر اگر وہ ثابت قدم رہتے تو قوم کو بہت جلد حقائق کا احساس ہو جاتا کیونکہ بعض اوقات تلخ باتیں بہت دیر سے سچ ثابت ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کہ صدر زرداری مذہبی جماعتوں اور بالا دست صوبے کی فوج کے سامنے اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے۔

اس بات کا اگر ہم حقیقت پسندی سے جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ ایک طرف قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں خانہ جنگی جیسی صورتحال ہے، عوام کی نفرتوں میں اضافہ ہو رہا ہے، ایسے میں سرحد پار کوئی بھی ناخوشگوار صورتحال ملکی سالمیت کے لئے سود مند ثابت نہ ہوگی۔ اسلام کے نام پر ہم نے افغانستان و کشمیر کی میزبانی تو کی مگر اس کے عوض ہمارے اپنے لوگوں کو بارود کے ڈھیر پر بٹھا دیا گیا۔ اب دنیا کے ٹھیکہ دار کشمیریوں اور افغانیوں کی تلاش میں بے حساب ہمارے لوگوں کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ اگر بات اپنی دھرتی پر تمام وسائل کے حقوق کے حصول کی ہے تو بلوچستان میں بھی یہی جنگ جاری ہے۔ پاکستان کے رکھوالوں کو اگر کشمیریوں کو دہشت گرد کہنے پر اعتراض ہے تو انہیں بلوچستان سے متعلق اپنے نقطہ نظر پر بھی نظرِ ثانی کرنا ہوگی اور اس وقت ملک کے حالات جس موڑ پر آ کھڑے ہیں، ایسے میں ہم مہمانوں کی خاطر اپنا گھر تباہ کرنے اور موت قبول کرنے کے قابل نہیں رہے۔ اب اپنے گھر کو بچانے کیلئے مصیبت بنے ایسے مہمانوں سے جان چھڑانا ہوگی۔ ایک اچھا موقع تھا کہ صدر زرداری اپنی بات پر قائم رہ جاتے اور تمام باشعور ترقی پسند جمہوری حلقے ان کی بات کو بڑھاوا دیتے۔ یوں کشمیر و افغانستان کے بن بلائے مہمانوں سے ہمیں نجات حاصل ہو جاتی۔ اب بھی اگر صدر زرداری مذہبی جماعتوں، فوج اور بالا دست صوبے کے خوف سے اپنی بات سے دستبردار ہو گئے ہیں تو کوئی بات نہیں، یہ بات ملک کے باشعور لوگ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اسلام اور پاکستان کے نام نہاد ٹھیکے دار تنقید کا نشانہ ضرور بنائیں گے۔ کیونکہ یہ بات تو سچ ہے، صرف اس پر ثابت قدم رہنے کی ضرورت ہے۔

(24 اکتوبر، 2008ء)

ذہنی زلزلوں سے قوم کو بچانا ہوگا

بلوچستان کے تمام مسائل کا حل ہمیشہ تعلیمی پسماندگی کا خاتمہ بتایا جاتا ہے۔ مختلف رپورٹوں کے ذریعے ناخواندگی کے اعداد وشمار بھی بتائے جاتے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہماری بدحالی کا ذکر کر کے ہر دور میں ہمیں نااہل ثابت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے اور یہ ایک تلخ حقیقت بھی ہے کہ تعلیم کبھی بھی ہماری ترجیح پر نہیں رہی ہے۔ سیاسی جماعتوں نے ہمیشہ تعلیم کو عام معاشرتی مسئلہ جان کر نظر انداز کیا ہے، جس کے باعث ہماری سرزمین کی وسیع وعریض سرحدوں میں تعلیمی اداروں کا شدید فقدان رہا ہے۔

یہ اعداد وشمار قوم کا درد رکھنے والے کسی بھی اہلِ دل کو دہلانے کیلئے کافی ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ سرزمین پر تو زلزلے آتے رہے لیکن کسی دل نے ذمہ داری کا یہ زلزلہ محسوس نہیں کیا۔ اب تو اس قلیل تعداد کی بھی یہ حالت ہے کہ بقول صوبائی وزیر تعلیم کے کہ کوئٹہ شہر کے 25 فیصد اسکول ناقابلِ استعمال ہو چکے ہیں، جبکہ محکمہ تعلیم کی رپورٹ کے مطابق صرف زیارت کے 255 اسکولوں میں 250 اسکول مکمل تباہ ہو چکے ہیں۔ اس رپورٹ کے بعد حکومت ہر دو دن بعد مزید دو روز کی تعطیلات کا اعلان کر دیتی ہے لیکن اس صورتحال کے مستقل حل پر کسی نے توجہ دینے کی زحمت نہیں کی اور یہی کیفیت اگر جاری رہی تو جانی اور مالی نقصان کے بعد ہم انتہائی غفلت اور بے خیالی میں اپنا مستقبل بھی غیر محفوظ کر دیں گے۔ اس سلسلے میں شعبہ تعلیم کو اپنی زندگی وقف کر دینے والے ایک پروفیسر کا کہنا ہے کہ ہمارے صوبہ میں تعلیم کا انحطاط ون یونٹ کے خاتمے کے بعد ہوا جس کا ذمہ دار وہ سیاستدانوں کو ٹھہراتے ہیں۔ اپنی ایک تحریر میں پروفیسر ڈاکٹر محمود علی شاہ لکھتے ہیں کہ بلوچستان میں جب معلم دو اقسام کے ہوتے تھے، ایک سرکاری استاد اور دوسرے مذہبی مولوی۔ مگر بلوچستان کے سماجی ڈھانچے میں دونوں کو ادب احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سرکاری اساتذہ کا تعلق زیادہ تر پنجاب کے علاقہ ڈیرہ غازی خان سے ہوتا تھا اور وہ سال بھر میں

بہت کم اپنے گھروں کو جاتے ہیں اس لئے قبائلی علاقوں میں وہ معزز مہمانوں کی طرح رہتے تھے اور مکمل وقت درس کو دیتے تھے۔ جس کے باعث طلبہ کو اسکول اوقات کے بعد بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں کوئٹہ کا مشہور اسکول سنڈیمن تھا جبکہ پورے صوبہ میں صرف ایک سائنس ڈگری کالج تھا، جو قیام پاکستان سے کچھ برس قبل 1942ء میں قائم کیا گیا تھا جبکہ اساتذہ کی کارکردگی پر ایسی کڑی نظر رکھی جاتی تھی کہ اگر کسی اسکول کے نتائج بہتر نہ آتے تو بطور سزا ان اساتذہ کے الاؤنس اور تمام انکریمنٹ روک دیے جاتے تھے۔

جب 1969ء میں ون یونٹ کا خاتمہ ہوا تو پنجاب کے تمام اساتذہ کو عجلت میں واپس کر دیا گیا جس کے باعث تعلیمی میدان میں جو خال پیدا ہوا ہم وہ خال بھرنے کے اہل نہ تھے' تعداد اور معیار دونوں کا فقدان تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ خال آج بھی برقرار ہے۔ قبائلی سرداروں اور بااثر افراد نے اپنے من پسند افراد محکمہ تعلیم میں بھرتی تو کرالئے مگر وہ صرف تنخواہ کے مالک بنے۔ تعلیم سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا اور کلاس نہ لینا تو قبائلی افراد اپنی بڑائی سمجھتے تھے۔ پھر اگر کسی اسکول میں کوئی آبادکار ہیڈ ماسٹر ہوتو دیگر مقامی اساتذہ اسے ڈرا دھمکا کر خوفزدہ کرتے تھے۔ مختلف علاقوں میں تو یہ بھی ہوتا رہا کہ اساتذہ اپنی قبائلی دشمنی کی وجہ سے ڈیوٹی پر مسلح ہو کر آتے اور کلاس میں اسلحہ لے کر بیٹھتے۔ اس بدعنوانی اقربا پروری پر تمام ذمہ دار و باشعور قوتوں نے بھی چپ سادھ لی۔ جس کے نتائج یہ برآمد ہوئے کہ ہماری تعلیم کو نقل کی دیمک لگ گئی، یعنی کہ شرح کے اعداد و شمار میں تو ویسے بھی ہم بہت کم تھے اور اب معیار میں بھی پستی کا شکار ہو گئے۔ جس کے باعث ہمارے طالبعلم کہیں بھی امتحان میں مقابلے کے قابل نہ رہے۔ یہی سبب ہے کہ اب نہ صرف محکمہ تعلیم میں بلکہ تمام شعبوں میں اعلیٰ و معیاری تعلیم یافتہ افراد ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ ایک عرصہ بیت جانے کے بعد بھی ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم اپنی سماجی حیثیت تبدیل کرنے کیلئے اپنے بنگلوں کا سائز تو بڑھاتے رہے اور آرام دہ سفر کیلئے گاڑیاں بھی تبدیل کرتے رہے مگر تعلیم کا سفر ہم نے ہمیشہ پیدل ہی طے کرنا چاہا۔ اس لئے اب تک ہم تعلیم کے گلی کوچوں اور چوراہوں میں ہی الجھے رہے ہیں۔ منزل کا حصول تو دور ہم تو ابھی تک شعور کی شاہراہ پر بھی نہیں آئے اور یہ تب ممکن ہے جب قومی حقوق کی جنگ لڑنے والے تعلیم کو اپنی پہلی ترجیح پر رکھیں گے۔ ورنہ یہ سوال سانپ بن کر ہمارے وجود کو ڈستا رہے گا کہ اگر ہمارے تمام وسائل پر ہمارا حق تسلیم کر لیا جائے تو کیا ہم اس قابل ہیں کہ ان وسائل و اختیارات کا درست استعمال کر سکیں۔

حالیہ زلزلے نے سرکاری اسکولوں کی عمارتوں کو ناکارہ بنا دیا ہے۔ مگر اس کے حل کیلئے حکومت کو تعطیلات میں اضافہ کرنے کے بجائے کوئی پائیدار حکمت عملی طے کرنا چاہئے اور حکومت کو معیاری تعلیم کے اداروں کے قیام کا کام میگا پراجیکٹ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ نہ صرف حکومت بلکہ تمام ذمہ دار سیاسی قیادت کو قوم کو جنگی حالت میں سمجھتے ہوئے تعلیمی پسماندگی کیلئے اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو جس طرح اب ہمارے تعلیمی ادارے ناکارہ اور ناقابل استعمال ہو رہے ہیں، کچھ عرصے بعد ہمارا مستقبل بھی ناکارہ کہلائے گا اور جن قوموں کا مستقبل ناکارہ ہو جاتا ہے وہ صرف تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تمام ناکامی اور نحوست کا ذمہ دار وقت کی سیاسی قیادت ہوتی ہے۔ اگر آج کی سیاسی قیادت نے اپنی ذمہ داری محسوس نہ کی تو تاریخ کے اس الزام سے وہ اپنا دامن نہیں بچا پائے گی۔ اس لئے سیاسی سماجی اور تمام باشعور قوتوں کو بلوچستان کی تعلیم کی بہتری کیلئے کسی حکومتی امداد کا انتظار کئے بغیر انفرادی و اجتماعی کردار ادا کرنا چاہئے۔ اگر ان تمام حلقوں نے اپنی سرزمین پر تعلیم کا بیج بو دیا تو آنے والی نسلیں بھی محفوظ ہو جائیں گی اور شعور کی شمع سے قومی وجود روشن ہو جائے گا، پھر کسی زلزلے سے عمارتیں تو متاثر ہو سکتی ہیں مگر کوئی بھی زلزلہ باشعور ذہنوں کو لرزش نہیں دے سکتا۔ اس لئے ذہنوں کی اس پختگی کیلئے تعلیمی ترجیح کا یہ سفر ہمیں ہر حال میں شروع کرنا چاہئے۔

(7 نومبر، 2008ء)

ایک قصے سے جڑی کئی کہانیاں

جب بلوچستان کے بہت بڑے ضلع نصیر آباد کو تقسیم کر کے سیاسی رشوت کے طور جمالی خاندان کیلئے الگ سلطنت جعفر آباد کا اعلان کیا گیا تھا تو کاغذی لکیروں میں بنے نئے ضلع کے باشندوں نے سوچا تھا کہ رقبہ، سرحدیں اور آبادی کم ہو جانے کے باعث اب شاید جعفر آباد کی قسمت جاگ اٹھے۔ جعفر آباد، تحریکِ پاکستان کے معروف رہنما میر جعفر خان جمالی کے نام سے منسوب ہے جن کی سیاسی وراثت کے دعویدار تو ظفر اللہ جمالی ہیں مگر موجودہ قومی اسمبلی کے رکن میر تاج محمد جمالی میر جعفر جمالی کے حقیقی فرزند ہیں۔ سابق وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی، پرویز مشرف کے بااعتماد ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے اور تاج جمالی پیپلز پارٹی کے ٹکٹ سے منتخب ہوئے ہیں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ فی الحال ہم ان لوگوں کی سوچ پر بات کرتے ہیں جن کا خیال تھا کہ وزارت عظمیٰ، سینیٹ کے ڈپٹی چیئر مین، صوبائی و قومی اسمبلی کے اہم عہدوں پر فائز اراکین اس علاقہ کی قسمت بدل دیں گے۔

کچھ عرصہ قبل ایسا ایک خواب بھی عوام کو دکھایا گیا کہ ان کے سفر کو سہل اور آرام دہ بنانے کیلئے ضلع بھر میں پختہ اور معیاری سڑکوں کا جال بچھا دیا جائے گا، جس کیلئے پورے علاقے کی سڑکوں کو کھود کر تمام رستوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ عوام نے یہ تکلیف اس لئے برداشت کی کہ پھر ایک آسانی مہیا ہو جائے گی مگر جس منصوبے کی تکمیل کا عرصہ ڈھائی سال تھا وہ گزشتہ 3 سال سے تاحال ممکن نہیں ہو سکا اور اب تو تعمیراتی ادارے بھی اپنی مشینری سمیت غائب ہو چکے ہیں، جس کے باعث عوام کو سہولت ملنا تو کجا اب ایک عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جعفر آباد میں ایف ایم آر پراجیکٹ کے تحت جاری ترقیاتی منصوبوں پر کام بند ہونے سے زرعی شعبے کو درپیش مشکلات بڑھ سکتی ہیں جس کا اثر مجموعی ترقی پر ہو سکتا ہے۔ بلوچستان کے نہری ضلع میں زرعی اجناس کی کھیتوں سے منڈی تک بروقت رسائی کو ممکن بنانے کیلئے

عالمی مالیاتی اداروں کے تعاون سے 3 سال قبل فارم ٹو مارکیٹ پراجیکٹ کے تحت ضلع بھر میں پختہ سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا تھا، جس میں اوستہ محمد تا ڈیرہ اللہ یار 39 کلومیٹر اور ڈیرہ اللہ یار تا صحبت پور حیر دین 40 کلومیٹر سڑک کی تعمیر کیلئے اخراجات کا تخمینہ 90 کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔ نئی سڑک کی تعمیر کے انتظار میں پرانی سڑکوں کی مرمت ودیکھ بحال نہ ہونے کے باعث ان سڑکوں پر سفر اب کسی عذاب سے کم نہیں جبکہ اس سلسلے میں محکمہ بی اینڈ آر کے مقامی افسران کا کہنا ہے کہ پرانی سڑکوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ایف ایم آر پراجیکٹ کی ہے۔ پرانی سڑکوں پر جابجا گڑھے پڑ جانے کی وجہ سے مسافت کا دورانیہ بڑھ گیا ہے، جس سے مسافروں کو سخت تکلیف کا سامنا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جعفر آباد چاول کی کاشت میں بہت ہی خود کفیل ہے اور ان سڑکوں کی وجہ سے اندرونِ ملک و کراچی کیلئے چاول کی نقل وحمل میں چاول کے تاجروں کو بھی کئی مسائل درپیش ہیں۔ اس سلسلے میں مقامی رائس ملز کے مالکان کا کہنا ہے کہ صرف اوستہ محمد میں 60 سے زائد رائس ملوں میں سالانہ کروڑوں میں چاول صاف کر کے ایکسپورٹ کیلئے کراچی بھیجا جاتا ہے لیکن گزشتہ 2 سالوں سے بڑے ٹرک اور ٹرالران سڑکوں پر آنے سے گریز کرتے ہیں جس کی وجہ سے مل مالکان کو بھی لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔

اس منصوبہ کے تحت ڈیرہ اللہ یار تا اوستہ محمد اور صحبت پور کشادہ اور معیاری سڑکوں کی تعمیر سے نہ صرف سندھ و بلوچستان کے دوطرفہ کاروبار کو فروغ حاصل ہوگا بلکہ اس سڑک کو شہداد کوٹ سے قریب ہائی وے سے جوڑ کر مواصلات کے مرکزی نیٹ ورک سے ملا دیا جائے گا، جس سے بلوچستان کی زراعت اور تجارت کیلئے بین الاقوامی راہیں کھل جائیں گی اور کوسٹل ہائی وے کے ذریعے گوادر پورٹ تک باآسانی رسائی ہو جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس منصوبے کی بروقت تکمیل کو یقینی بنایا جائے تاکہ چاول کی تجارت سے حکومت کو حاصل ہونے والے زرِ مبادلہ کی آمد میں کوئی رکاوٹ نہ بنے اور لاکھوں ایکڑ رقبے پر کھڑی دھان کی کاشت کا مستقبل بھی محفوظ ہو جائے۔

یہ پورا قصہ تو صرف ایک ضلع کی حالت زار پر مبنی ہے جو مختلف اخبارات میں بھی رپورٹ ہو چکا ہے اور اگر مسائل کے شروع میں صرف ضلع کا نام ہٹا دیا جائے تو تقریباً ہر علاقہ کی حالت یکساں ہے، جہاں خستہ اور بوسیدہ سڑکوں کے باعث عام لوگ نہ صرف زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں بلکہ وہاں تجارت و کاروبار کے مواقع بھی محدود ہیں۔ روزگار کے ذرائع نہ ہونے کے باعث غربت کی لکیر سے بھی نیچے کی زندگی گزارنے والے نوجوان اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے جرائم کی جانب راغب ہوتے ہیں۔

مواصلات کے پُرسکون و آرام دہ نظام کی عدم موجودگی کے باعث اس ایک قصے کی کئی کہانیاں اور ان کہانیوں کے کئی کردار ہیں، جن کے جنم کے ذمہ دار براہ راست وہ منتخب اراکین ہیں جو انتخابات کے وقت ایسی کہانیوں کے خاتمے کا وعدہ کرکے ایوان تک تو پہنچتے ہیں مگر پھر وہ اپنی شہنشاہیت' بدعنوانی' اقربا پروری کی نئی داستانیں رقم کرنے میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ تمام تر اعلیٰ عہدوں کے باوجود بھی اگر جعفرآباد کی ترقی میں جمالی خاندان کا کوئی قابل ذکر کردار نہیں تو بلوچستان کے ہر ضلع میں ایک ایسا خاندان موجود ہے جو علاقہ کے تمام وسائل پر اپنے اختیارات و طاقت کا پھن پھیلا کر بیٹھا ہے، جو بھی ان وسائل کو چھونے کی کوشش کرتا ہے یہ خاندان ڈنگ مار کر اپنا پورا زہر اس پر گرا دیتا ہے اور پھر کئی سالوں تک کسی کو دوبارہ جرات نہیں ہوتی۔ لوگ غربت میں رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔

وسیع و عریض بلوچستان میں اب بھی پختہ سڑکوں' صاف پانی' صحت و تعلیم کی بنیادی سہولیات کا فقدان ہے' ہم جو آزاد قوموں کے شانہ بشانہ سفر کے خواہشمند ہیں مگر ہمارے دیہات اب بھی شہروں سے لاتعلق ہیں۔ ہمارے لوگوں کی زندگیاں اب بھی کسی مسیحا تک رسائی سے پہلے دم توڑ دیتی ہیں۔ آخر کب تک ہم اپنی ان سسکتی سانسوں کو قسمت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرتے رہیں گے' زندگی کی راہوں پر موجود اس کوہِ جاگیردار کو ہٹانے کیلئے کسی فرہاد کو تو آگے آنا ہوگا۔ پھر دودھ کی نہر نہ سہی ایک رستہ تو ہموار ہوگا جس پر ہم ایک ایسی منزل کیلئے گامزن ہوں گے جو شیریں بھی ہے، رنگین بھی ہے اور بہت پُرسکون بھی ہے۔

(12 نومبر، 2008ء)

قومی رنگ کو زنگ نہ لگ جائے

ہمارے ہمسایہ صوبہ سندھ کا تعارف درسی کتابوں میں تو یہی ہے کہ وہ باب الاسلام ہے، جہاں ایک ہندو حکمران کے اقتدار کا تختہ الٹ کر محمد بن قاسم نے دینِ اسلام کی تبلیغ کی لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں؛ کیونکہ محمد بن قاسم کی آمد سے بہت پہلے بھی سندھ اولیائے کرام کا مسکن رہا ہے اور بہت سارے معروف صوفی بزرگوں نے دین کے دائروں کو وسعت دے کر اجتماعی معاشرے کے قیام کی کوششیں کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں غیر مسلم حاکم کی حکمرانی کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ محمد بن قاسم کی یلغار کے بعد بھی سندھ کے تعارف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سندھ کے لوگ مذہبی تفریق کے بغیر اپنا صحن سب کے سپرد کرتے تھے اور ماضی کی تمام سیاسی تاریخوں اور تحریکوں میں سندھ نے شعور کے امام کا کردار ادا کیا ہے۔ اسی شعور کو کچلنے کیلئے حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو بھیجا تھا اور پھر یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ مختلف سازشوں اور حیلوں بہانوں کو مذہبی رنگ دے کر سندھ کے سیاسی سفر میں اسپیڈ بریکر لگائے جاتے ہیں۔ سندھ کے صوفی بزرگ شاہ لطیف، قلندر شہباز، سچل سرمست نے اپنے پیغام کو تنگ دائروں میں کبھی قید نہیں کیا، اس لئے آج بھی ان کی درگاہوں پر حاضری بھرنے والے صرف مسلمان نہیں ہوتے وہاں ہر رنگ، نسل، مذہب اور زبان کے لوگ جمع ہو کر امن و انسانیت کی بات کرتے ہیں۔

اسی بات کو آگے بڑھنے سے روکنے کیلئے کچھ لوگوں نے اپنی آسانی اور سہولت کیلئے دین کی نئی تشریح کر کے اپنی خواہش کی تکمیل کیلئے اپنے ذہن میں قید خیالات کو شریعت کا نام دے کر انہیں سب پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا ہی ایک منظر گزشتہ دنوں عالمی و مقامی میڈیا پر رپورٹ ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے سندھ کے ضلع شہداد کوٹ کے قریب ایک گاؤں مسکین پور میں ایک مذہبی رہنما نے اپنی طرز کی شریعت نافذ کر دی ہے۔

بلوچستان کی سرحد پر واقع پر شہداد کوٹ پرویز مشرف دور میں پیپلز پارٹی کا ووٹ بینک توڑنے کیلئے لاڑکانہ ضلع کو توڑ کر نیا ضلع تشکیل دیا گیا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شہداد کوٹ، شہید بینظیر بھٹو کا انتخابی حلقہ بھی ہے۔ یہاں کے شہر قمبر میں موجود غلام حسین شاہ کی کرامات کے بھی بڑے چرچے ہیں۔ان کے عقید تمندوں کی بڑی تعداد بلوچستان کے شہروں میں بھی آباد ہے۔ یہ وہی حسین شاہ ہیں جن کے قدموں میں بینظیر جا بیٹھی تھیں اور بینظیر کی شہادت کے بعد یہ تصویر بڑی مقبول ہوئی۔ بہر حال منفرد شناخت رکھنے والا شرعی گاؤں مسکین پور 70 گھرانوں پر مشتمل ہے اور کئی برسوں سے اس گاؤں کی آبادی میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔گاؤں کے گادی نشین فقیر حضور بخش کا کہنا ہے کہ 1974ء میں ان کے والد غلام حیدر صدیقی نے اس گاؤں کی بنیاد رکھی تھی۔ جہاں کتا' ٹی وی' ریڈیو' تصویر اور کوئی بھی ساز رکھنا منع ہے۔ جماعت اہلسنت کے نقشبندی فرقہ سے تعلق رکھنے والے فقیر حضور بخش نے مزید بتایا کہ اس گاؤں میں رہائش کے خواہشمندوں سے شریعت پر پابندی کا حلف لیا جاتا ہے اور یہاں کوئی بھی مرد بغیر دستار کے اور خاتون بغیر پردہ کے داخل نہیں ہوسکتی۔شادی بیاہ کے موقع پر ڈھول یا شادیانہ بجانے پر پابندی ہے۔ ہر مرد کی ایک مشت داڑھی ہونا لازم ہے۔عورتوں کے باہر جانے اور اسکولوں کی تعلیم پر پابندی ہے اور اصولوں کی انحرافی پر کسی بھی شخص کو بیدخل کر دیا جاتا ہے۔فقیر حضور بخش شریعت کا پُرامن نفاذ چاہتے ہیں ۔وہ طالبان کی طرزِ شریعت سے اختلاف رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شریعت کے نفاذ کی خاطر جبر یا ہتھیار کا استعمال نہیں کرنا چاہئے۔وہ شریعت ،حکومت اور برادری کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر کبھی بھی حکومت مخالف قدم اٹھانا نہیں چاہئے۔

یہ تو سندھ کا ایک گاؤں ہے جو میڈیا کی آنکھوں نے دیکھ لیا ہے۔نہ جانے ایسے نام نہاد شرعی گاؤں اور کتنے اور کہاں کہاں ہوں گے جہاں پر ایک شخص اپنی خواہشوں کو شریعت کا نام دے کر عوام کی آزادی سلب کر رہا ہوگا اور خدا نہ کرے کہ ایسا کوئی گاؤں بلوچستان میں ہو کیونکہ بلوچستان کے قومی رنگ پر اگر مذہبی رنگ کا تڑکہ لگا تو عوام کو زنگ لگ جائے گا۔اس لئے بلوچستان کی سیاسی اور شعوری قوتوں کو خبردار ہو کر اس جانب خصوصی توجہ دینا ہوگی۔ سندھ کے شاندار سیاسی تعارف کو مسخ کرنے کیلئے ایک سازش کے تحت مختلف شہروں میں مذہبی ڈیرے بنائے گئے ہیں تاکہ اصل عوامی اور سیاسی تحریکوں سے عوام کا رشتہ توڑ کر غریب و بے بس لوگوں کو مذہبی طور پر خوفزدہ کر کے پیروں' فقیروں' خلیفوں اور پیش اماموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ایسی صورتحال میں کہتے ہیں کہ انسان اگر عقلمند ہو تو اپنے ہمسائے میں چوری اور ڈکیتی کے

بعد وہ اپنے گھر کے حفاظتی انتظامات سخت کر لیتا ہے۔ اس لئے اب ہمارے ہمسائے صوبہ سندھ کے شعور پر مذہبی ڈاکہ پڑ رہا ہے تو ہمیں اپنے گھر کی شعوری دیواروں کو اور مضبوط کرنا ہوگا۔ مذہب کے نام پر اگر بلوچ عوام کو اصل مقصد سے گمراہ کیا گیا تو یہ ایک ایسا نقصان ہوگا جس کی تلافی کیلئے آئندہ نسلوں کو آگ اور خون کے دریا سے گزرنا ہوگا، اس لئے اپنے وطن کی نظریاتی سرحدوں' اپنی قومی تحریک اور جدوجہد کے تحفظ اور اپنی آنے والی نسل کو بحرانوں سے محفوظ رکھنے کیلئے، ہمیں اپنی حکمت عملی میں یہ نقطہ بھی شامل کرنا ہوگا کہ دشمن اس محاذ سے بھی حملہ کرسکتا ہے، کیونکہ مذہبی پیشواؤں نے ہمیشہ ریاست کا ساتھ دیا ہے اور ریاست اس وقت بلوچ حقوق اور مفادات کی محافظ نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں جدوجہد کے کسی بھی محاذ سے غافل ہونے کے بجائے عوام کا تعلق شعوری محاذ سے مزید مضبوط کرنا ہوگا۔

(13 نومبر، 2008ء)

درد کے سمندر میں ڈوبتے ماہی گیر

دنیا میں ایسی آبادی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہے جو اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت خطروں سے کھیلنے کے باوجود اپنا تحفظ یقینی نہیں بنا سکتی' ان محنت کشوں میں ماہی گیر بھی شامل ہیں جن کا ہر سال 21 نومبر کو عالمی دن منایا جاتا ہے۔ دنیا میں تا حال تو یہ روایت عام ہو رہی ہے کہ کسی بھی دن کو کسی خاص نام سے منسوب کر کے ہر سال اسے منانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اس دن سے وابستہ افراد سے متعلق کبھی نہیں بتایا جاتا کہ یہ دن مخصوص کرنے سے ان لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔

پاکستان کا ساحل 1050 کلومیٹر پر محیط ہے جس میں 700 کلومیٹر ساحل بلوچستان کا ہے۔ باقی 350 ساحل سندھ کا علاقہ ہے اور ان ساحلی علاقوں میں 40 لاکھ ماہی گیروں کی بستیاں آباد ہیں، جن میں سے 20 لاکھ سمندری ماہی گیر جبکہ 20 لاکھ میٹھے پانیوں کے ماہی گیر ہیں جو حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے مالی مشکلات کا شکار ہیں۔ شہروں سے دُور ساحلوں پر آباد یہ بستیاں صحت' تعلیم' بجلی' گیس' روڈ' روز گار و دیگر بنیادی سہولیات کیلئے ترس کر رہ گئی ہیں۔ دنیا میں سمندری وسائل اور ماہی گیری پر کہیں بھی ٹھیکیداری نظام رائج نہیں لیکن سندھ میں میٹھے پانیوں کے وسائل، 1209 جھیلوں پر ٹھیکیداری جیسا ظالمانہ نظام مسلط کیا گیا۔ ان جھیلوں پر روزگار حاصل کرنے والے 5 لاکھ ماہی گیر ٹھیکیداروں کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ تمام خطرات سے لڑ کر جب کناروں پر پہنچتے ہیں تو انہیں یہ بھی حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گھر مچھلی لے جائیں، اس لئے وہ مارکیٹ میں آزادانہ مچھلی فروخت کرنے کے بجائے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں یرغمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ 1965ء کے بعد سمندری حدود کی خلاف ورزی کا بہانہ بنا کر پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں نے گرفتاریوں کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ تا حال جاری ہے۔ کیونکہ روز گار کی تلاش میں جانے والے ماہی گیر سمندری حدود کے واضح نشانات نہ ہونے کی وجہ سے اکثر گرفتار ہو جاتے

ہیں اور اس وقت صورتحال یہ ہے کہ 400 سے زائد بھارتی ماہی گیر پاکستانی جیلوں میں اور 50 کے قریب پاکستانی ماہی گیر بھارتی جیلوں میں قید ہیں۔

دنیا بھر کی طرح اس ملک میں بھی مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ اشیائے خورد ونوش وروزمرہ استعمال کی چیزیں اکثریتی انسانوں کی پہنچ سے دور ہوتی جارہی ہیں لیکن گزشتہ 26 سال سے مچھلی اور جھینگے کا ریٹ 1982ء والا ہی برقرار ہے جبکہ ماہی گیر اپنے گھر کیلئے وہی خریداری کرتے ہیں جو چیزیں ایک عام انسان کو ضرورت ہوسکتی ہیں جبکہ مچھلی مار کر آنے والے ماہی گیر کو بیوپاری' مول ہواڑ' فش مالکان' ایکسپورٹر مختلف بہانوں سے کم ریٹ دیتے ہیں جس سے ماہی گیر کے بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فش مالکان نے پولٹری فیڈ میں استعمال ہونے والی مچھلی کے دام یہ بہانہ بنا کر کم کر دیے ہیں کہ بیرون ممالک سے میٹ میل درآمد کی جارہی ہے جو مقامی فیڈ سے بہت سستی ہے، اس لئے وہ مچھلی کا زیادہ ریٹ نہیں دیں گے۔

اس وقت درآمد کنندگان بیرونِ ممالک سے بڑے پیمانے پر سؤر کے گوشت سے تیار کردہ غیر صحت منداور غیر معیاری مرغیوں کا فیڈ غیر قانونی طریقے سے خرید کر ملک میں فروخت کر رہے ہیں جس سے ماہی گیری سے وابستہ لاکھوں افراد کے بیروزگار ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس ملک کی ساٹھ سالہ تاریخ میں آج تک پائیدار فشریز پالیسی مرتب نہیں کی جاسکی۔ حکومت پاکستان نے صرف ڈیپ سی فشنگ پالیسی مرتب کی ہے جس سے مخصوص مفادات کے تحت ڈیپ سی ٹرالرز کو لائسنس دینے اور فیس لینے تک محدود کر دیا گیا ہے لیکن ماہی گیری کے تحفظ اور ماہی گیروں کے روزگار کی ضمانت کبھی نہیں دی گئی۔ وفاقی حکومت نے 2 نومبر 2007ء کو غیر متعلقہ افراد کے مشورے سے جس قومی فشریز پالیسی کا اعلان کیا ہے، وہ ماہی گیروں کے مفادات وسماجی تباہی کا سبب بنے گی۔

اس ملک کے موجودہ پارلیمانی ڈھانچے میں کسان' مزدور، خواتین واقلیت کیلئے نشستیں مخصوص ہیں مگر افسوس کہ ماہی گیروں کا کوئی نمائندہ اسمبلی میں نہیں پہنچتا' نہ ہی کسی جماعت کے رکن کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ اس نظر انداز کیے گئے طبقے کے مسائل پر آواز اٹھائے۔ اگر ہر سال صرف ماہی گیروں کا دن منانا ہی مقصود ہے تو یہ دن ماہی گیروں کیلئے بے معنی ہے۔ بلوچ ساحل سے وابستہ ہزاروں ماہی گیر اپنے بچوں کے مستقبل سے بے خبر گہرے سمندر کی موجوں سے لڑتے رہتے ہیں، ان کی اپنی زندگی ایک منجدھار میں قید ہے اور غموں کے سمندر میں ڈولتی ان کی کشتی کو کنارے لگانے والا کوئی بھی نہیں۔

یہ دن اس ملک کے پالیسی سازوں سے تقاضا کرتا ہے کہ ایک ایسی پالیسی مرتب کی جائے جس میں ماہی گیروں کے روزگار کا تحفظ سمیت ان کی آبادیوں تک سہولیات کی فراہمی کی ضمانت ہو، ورنہ درد کا سمندر اپنے اندر لئے یہ ماہی گیر مشکلات سے ٹکراتے رہیں گے اور کوئی بھی دن ان کی زندگی میں تبدیلی کی وجہ ثابت نہ ہو سکے گا۔

(21 نومبر، 2008ء)

برابری، برداشت کو جنم دیتی ہے

جب پوری دنیا کے باشعور وامن پسند انسان معاشرے میں بڑھتے ہوئے عدم برداشت کے رجحانات کے خلاف دنیا بھر میں برداشت ورواداری کو فروغ دینے کیلئے عالمی دن منارہے تھے تو ٹھیک اسی دن بلوچستان کے علاقے مشکے میں سیکورٹی فورسز اپنے اختیارات وطاقت کا استعمال کر رہی تھیں۔

ہر شخص کا جس طرح زندگی گزارنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے بالکل اسی طرح اداروں کی بھی ایک اجتماعی نفسیات ہوتی ہے' جیسے کچھ لوگ منشیات کے اس قدر عادی ہوجاتے ہیں کہ کوئی نشہ اُن پر اثر نہیں کرتا تو وہ اپنی عادت پوری کرنے کی خاطر اپنی زبان سمیت جسم کے مختلف حصوں پر زہریلے سانپوں سے ڈنگ مرواتے ہیں، اسی طرح بلوچستان میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار بھی بارود برسانے کے ایسے عادی ہوگئے ہیں کہ جب تک ان کی بندوقیں انسانی خون نہ چکھ لیں تب تک ان کے کلیجے میں ٹھنڈ نہیں پڑتی' اس لئے یوم برداشت صرف یکطرفہ ہوتا ہے جو عوام الناس کی ذمہ داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جبری مملکت میں صرف جولائی 2007ء سے اب تک 88 خودکش حملے ہوچکے ہیں جن میں 1185 افراد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں جس کی مکمل ذمہ دار یہ ریاست ہے کیونکہ یہاں ریاست کی فرسودہ وتنگ نظر پالیسیوں کے باعث اختلاف رائے کو برداشت کرنے کے بجائے طاقت سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ریاستی طاقت کے ردِعمل میں لوگ مسلح ہوجاتے ہیں، عدم برداشت کا رویہ پروان چڑھتا ہے اور کئی عسکریت پسند گروپ وجود میں آجاتے ہیں۔

عالمی سطح پر عدم برداشت کے حوالے سے پاکستان کا نام سرفہرست ممالک میں شامل ہے۔ پاکستان کے حکمران برداشت ورواداری کا درس تو دیتے ہیں مگر اس پر عمل کرنے کیلئے صرف عوام کو ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ انتخابی مہم میں امیدوار اپنے حلقہ کے ووٹروں سے وعدے کرکے ووٹ حاصل کرتا ہے اور

پھر ایوان میں پہنچ کر وہ وعدے وفا نہیں کرتا' اسکول اور ہسپتال کے داخلہ سے لے کر روزگار و دیگر بنیادی سہولیات کے حصول تک سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں بدعنوانی اور اقربا پروری کا ایسا دور دورہ ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا مزاج رکھنے والا شخص بھی اپنے بال نوچ کر برداشت کو الوداع کہتا ہے اور جب ایک بے بس ولاچار مجبور ومحکوم انسان برداشت کا دامن چھوڑ کر کسی کا گریباں پکڑ لیتا ہے تو پھر اس کے سامنے ساری طاقتیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔

عالمی سطح پر یومِ برداشت تو منایا گیا مگر کسی ماہر نے یہ اظہار نہیں کیا کہ آخر عدم برداشت میں روز بروز اضافہ کیوں ہو رہا ہے' یقیناً اس کے طبی اور نفسیاتی پہلو ضرور ہوں گے لیکن سب سے اہم پہلو معاشرتی ہے کیونکہ جب معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی رشتوں میں اعتماد کا فقدان ہو جائے' وسائل کا حصول طاقت اور سہولیات کی فراہمی سماجی حیثیت کے مطابق ہونے لگے تو تعلقات کا توازن بگڑ جاتا ہے اور پھر چند لوگ طاقت اور دولت کے زور پر اکثریتی لوگوں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔ اس بگڑے توازن کی بحالی کیلئے کسی تبلیغ کی نہیں بلکہ اپنے رویوں میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور رویوں میں یہ تبدیلی تب آتی ہے جب انسان ذہنی طور پر جنگل کا قانون ختم کر کے وسائل پر سب کا یکساں حق تسلیم کر لے' سنگینیوں کے سائے میں عدم برداشت کا سبق نہیں سکھایا جاتا' حقوق مانگنے والے نہتے لوگوں کی لاشیں گرا کر امن کی باتیں کرنے سے برداشت کو فروغ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے دنیا کے سارے انسانوں کو بے ہتھیار کرنے سمیت تمام وردی والوں کو سرحدوں پر مقرر کیا جائے۔ مذہب' قومیتوں' ثقافت کے تنازعات کا خاتمہ کر کے تمام وسائل پر حقِ ملکیت اس سرزمین کے اصل باشندوں کا تسلیم کیا جائے۔ عوام کو تقریر' تحریر اور اظہار کی آزادی ہو' مطلب کہ عدم برداشت کی ہر وجہ ختم کی جائے تو پھر ہم بلوچ برابری کی بنیاد پر دنیا کی ترقی کے سفر میں شریک ہوں گے اور یہ دن بے معنی ہو جائے گا۔

(26 نومبر، 2008ء)

آزادی ہماری' اختیار کس کا؟!

اس ملک کے قیام سے قبل قابض گوروں نے اپنے نظام کی حفاظت کیلئے ہم میں سے وفادار نگرانوں کا انتظام کرکے برصغیر کوالوداع کیا تھا پھر وہاں سے بیٹھ کر ڈور ہلانے والا کام ہنوز جاری ہے۔ پاکستان و بھارت میں حکمران منتخب ہو کر آئیں یا قومی مفاد کیلئے اقتدار پر مسلط ہو جائیں، دونوں صورتوں میں گوروں کی رضامندی لازم ہے۔ اس لئے وہ گورے اپنے ملک سے زیادہ ہمارے علاقوں کیلئے فکرمند نظر آتے ہیں۔ اب جب گوروں کا صدر ایک سیاہ فام منتخب ہو چکا ہے تو اپنے نئے صدر کو عالمی سیاسی صورتحال سے متعلق گائیڈ لائن دیتے ہوئے امریکی خفیہ ادارے نے ایک رپورٹ جاری کی ہے جس میں پاکستان کو ممکنہ ناکام ممالک کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ امریکی دانشوروں کے مطابق صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں حکومت کی رٹ قائم نہ ہو سکے گی، اس لئے افغانستان سے دراندازی معمول ہو جانے کے باعث ڈیورنڈ لائن کی اہمیت ختم ہو جائے گی اور پاکستان وافغانستان کے پشتون ایک ہو جائیں گے۔ اسی مفہوم سے مطابقت رکھنے والا ایک مضمون نیویارک ٹائمنر میں بھی شائع ہوا ہے جس میں جنوبی ایشیا کے ایک نقشے کا عکس ہے کہ بہت جلد اس ملک کی جغرافیائی سرحدیں مختصر ہو جائیں گی۔ مذکورہ نقشے میں بلوچستان کی سرحدوں کو محدود کرکے آزاد ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ انکشاف بھی ہے کہ پاکستان کو توڑنے کیلئے امریکہ' افغانستان، ایران اور بھارت کی مدد کر رہا ہے۔ اس رپورٹ کے بعد پاکستان کے فوجی وسول حکام میں کھلبلی مچ گئی ہے اور انہیں احساس ہوا ہے کہ جس امریکہ کی دوستی میں وہ اپنے ملک کے عوام کی ناراضگی برداشت کر رہے ہیں، وہی امریکہ نہ صرف بمباری کر رہا ہے بلکہ اس ملک کی تباہی کیلئے بھی کوشاں ہے۔ اب پاکستانی حکام کو اپنی جوہری توانائی کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی ہے۔

ان دو رپورٹوں کے بعد بارک اوبامہ جنوبی ایشیا کیلئے کیا سیاسی حکمت عملی طے کرتے ہیں یہ تو

بعد کی بات ہے لیکن بلوچستان کے موجودہ سیاسی حالات میں ان رپورٹس کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ حال ہی میں پشتون رہنما محمود اچکزئی کا انٹرویو بھی کافی متنازعہ ثابت ہوا تھا۔ پھر یہ امریکی رپورٹس تو بلوچوں کو دعوتِ فکر دے رہی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچستان اپنی جغرافیائی حیثیت اور معدنی وسائل کی وجہ سے دنیا کی سپر طاقتوں کیلئے مرکز نگاہ بنا ہوا ہے لیکن امریکہ یہاں اپنے من پسند حکمرانوں کی مدد سے فوجی اڈے قائم کر کے وسط ایشیا کے تمام ممالک پر اپنی طاقت کا استعمال چاہتا ہے جبکہ دوسری جانب امریکہ کا حریف چین ہے جو ساحلِ گوادر سے اپنی مصنوعات کی مارکیٹ چاہتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ اس معاملے میں براہِ راست شریک دو اور فریق بھی ہیں جن میں ایک تو حکومتِ وقت ہے جبکہ دوسرے اس سرزمین کے اصل وارث بلوچ ہیں جو ایک طویل عرصے سے اپنی سرزمین کے تمام وسائل پر حقِ ملکیت کیلئے مزاحمتی جدوجہد میں برسرِ پیکار ہیں۔ دنیا کی اس نئی بحث میں آزاد بلوچستان کا ذکر ضرور ہے' مگر یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ اس آزادی پہ اختیار کس کا ہوگا۔ اگر وسیع و عریض بلوچستان کی سرحدوں کو سکیڑ کو مجوزہ امریکی آزادی پر بلوچ رضا مند ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری قومی جدوجہد امریکی معاونت سے جاری ہے اور ہم اس انتظار میں ہیں ہمارے ہمسائے جب نصف دھرتی اور آسمان لے جائیں گے تو باقی ماندہ بلوچستان آزادی کی طشتری میں رکھ کر ہمیں پیش کیا جائے گا! اور کیا ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ و چین کی عالمی جنگ میں چین کے مقابلے میں امریکہ ہماری آزادی کا بہتر محافظ ثابت ہوگا؟! یہ چند اور ان سے ملتے جلتے کئی سوال ہر بلوچ کے ذہن میں میدان جنگ بنائے ہوئے ہیں، جن کے جوابات کیلئے قومی دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کو ایک واضح حکمتِ عملی دینا ہوگی تاکہ بلوچ عوام کو یہ معلوم ہو سکے کہ ہمیں جو امکانی آزادی ملے گی تو اس پر اختیار کس کا ہوگا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بلوچوں کے پاس کوئی مارکیٹ نہیں ہے۔ صوبہ کے چند بڑے شہروں پر بھی ہمارا بس نہیں چلتا، اس لئے عالمی سرمایہ کاروں کی ترجیح پر ہم نہیں آتے' باقی جا بچتا ہے امریکہ جو اسلحے کا بیوپاری ہے اور اس ملک کی فوج اس کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ یہی اسلحہ ایک عرصے سے نہتے بلوچوں پر استعمال ہو رہا ہے۔ پاکستان کے حکمران بھی بلوچستان میں امریکی آمد کے انتظام کرنا چاہتے ہیں اور اگر بلوچ بھی آزادی کے عوض امریکہ کیلئے نرم گوشہ رکھتے ہیں تو پھر بظاہر اس ریاست کے اور ہمارے مقاصد یکساں ہو جاتے ہیں تو پھر ہم یہ کس کی لڑائی' کس کیلئے لڑ رہے ہیں!

یہ وہ تمام منجدھار ہیں جہاں ذہن کی کشتی آ کر رک جاتی ہے۔ اگر اس نازک اور کڑے وقت میں ہم نے عالمی تناظر میں اپنے مقاصد، اپنی جدوجہد قوم پر واضح نہ کی تو شکوک کے بادل اور افواہوں کی دھول میں ہماری نئی نسل گمراہ ہو جائے گی اور ایک نسل کا گمراہ ہونا قومی تباہی کی علامت ہوتا ہے، اس لئے قوم کا درد رکھنے والے تمام باشعور افراد کو اس نئی صف بندی میں قومی تشخص کے ساتھ اپنی شناخت کا اعلان کرنا ہوگا۔ ورنہ ایک آزادی 14 اگست کو بھی ملی تھی جس کے بعد آقاؤں کے صرف چہرے بدلے تھے، اس لئے بلوچوں کو اپنی آزادی یرغمال ہونے سے قبل اس پر قومی مہر ثبت کرنا ہوگی۔

(یکم دسمبر، 2008ء)

کمزور معمار غیر محفوظ مستقبل دیتے ہیں

یہ تو ایک عام سی بات ہے کہ ہر عمارت کی پائیداری کیلئے اس کی بنیاد کا مضبوط ہونا لازم ہے اور بچے جو قوم کے معمار ہوتے ہیں تو قوم کی پختہ عمارت اور مضبوط مستقبل کیلئے ان معماروں کا خوشحال و تندرست ہونا ضروری ہے۔ یہ ملک دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جنہوں نے اقوام متحدہ کے عالمی چارٹر پر دستخط کر کے اس بات کی ضمانت دی تھی کہ ان تمام ممالک میں بچوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا اور اس تحفظ کی ضمانت کا ثبوت یہ ہے کہ جب گزشتہ دن پوری دنیا بچوں کا عالمی دن منا رہی تھی تو پاکستان میں دو مائیں غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے جگر گوشوں کو ایدھی ہومز چھوڑ جاتی ہیں جبکہ لاہور میں یہی واقعہ ہوا ہے کہ پانچ معصوم بہن بھائیوں نے ایدھی ہومز میں آ کر پناہ لی ہے اور کئی ماہ سے بچے فروخت کرنے کا سلسلہ بھی اب معمول ہو گیا ہے۔

غربت کا یہ عفریت پوری دنیا میں دندناتا پھر رہا ہے جو روزانہ 26 سے 30 ہزار غریب بچوں کو نگل لیتا ہے اور آج بھی دنیا کا ہر دوسرا بچہ غربت کی آخری لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ ایسے بچوں کی تعداد ایک ارب سے زائد ہے جبکہ ایک سروے کے مطابق دنیا کی کل آبادی میں بچوں کی تعداد 2 ارب 20 کروڑ ہے' پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں ہر تیسرا بچہ مناسب خوراک نہ ملنے کے باعث بھوک وافلاس کا شکار ہے' ایسے بچوں کی تعداد 64 کروڑ ہے اور سب سے عام، معمولی اور آسان سہولت پانی کی فراہمی کو سمجھا جاتا ہے جس سے بھی دنیا کے بچے محروم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پینے کا صاف پانی اور نکاسی آب کی مناسب سہولت نہ ہونے کے باعث 14 لاکھ بچے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور دنیا کا ہر ساتواں بچہ صحت کی سہولیات سے بھی محروم ہے۔ مختلف بیماریوں کے حفاظتی ٹیکے اور مناسب ادویات نہ ملنے کے باعث 22 لاکھ بچوں کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے اور ہر ایک منٹ میں ایک بچے کی معصوم آنکھیں اپنی بینائی کھو کر دنیا دیکھنے سے محروم رہ جاتی ہیں، جبکہ 97 لاکھ بچے اپنی پانچویں سالگرہ تک پہنچنے سے پہلے ہی

وفات پا جاتے ہیں۔ عالمی سطح پر بچوں کی اموات کے حوالے سے دنیا میں سرائے لون پہلے نمبر جبکہ انگولا دوسرے اور افغانستان تیسرے نمبر پر ہیں۔ اس بدقسمت فہرست میں پاکستان کا نمبر 47 واں اور بھارت کا 49 واں نمبر ہے۔

بچوں کے عالمی دن پر جاری ہونے والے اعداد وشمار کے مطابق جدید ترقی کے سفر پر گامزن اس دنیا میں آج بھی 50 لاکھ بچے اسکول جانے سے قاصر ہیں جو اپنے کٹھن حالات میں جسمانی مشقت کرتے ہیں اور دنیا بھر میں 7 کروڑ 30 لاکھ چائلڈ لیبر ایسے ہیں جن کی عمر ابھی دس سال بھی نہیں ہوئی جبکہ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں آج بھی 51 لاکھ بچے بیگار کیمپوں میں غلامانہ طرز سے کام کرنے پر مجبور ہیں اور سالانہ 12 لاکھ بچوں کی مزدوری یا جنسی کارروائیوں کی غرض سے فروخت یا اسمگل کیا جاتا ہے۔ یونیسیف کے مطابق 15 کروڑ بچوں کی نشو ونما کم وزنی اور 18 کروڑ بچوں کی غذائی قلت کے باعث رک جاتی ہے۔ پاکستان میں غربت کے اضافے کی وجہ سے ہر دوسرا بچہ اسکول جانے کے بجائے محنت مزدوری کر کے اپنے والدین کا مددگار بنتا ہے اور مختلف کارخانوں یا گھروں میں 27 کروڑ بچے تشدد کا سامنا بھی کرتے ہیں ۔بچوں کے حقوق کی پامالی پر یونیسیف واقوام متحدہ نے رکن ممالک سے تاحال کوئی باز پرس نہیں کی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالمی اداروں کی ترجیحات میں بھی بچوں کے حقوق کی کوئی ضمانت نہیں۔

ہم جس معاشرے میں قیام پذیر ہیں یہاں بڑوں کے حقوق غضب کر دیے جاتے ہیں اور جب والدین کے حقوق محفوظ نہ ہوں تو بچوں کے حقوق کی ضمانت کون دے گا۔ اکثریتی عوام کی محرومی کے نتیجے میں معاشرے میں جو غصے، نفرت اور تشدد کا اجتماعی رویہ جڑ تا ہے، ان تمام رویوں کا سامنا ہمارے بچوں کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ہمارے انفرادی گھروں سے لے کر مذہبی، کاروباری وسیاسی اداروں تک بچے محفوظ نہیں ہیں۔ ہم نے بچوں کو ثانوی حیثیت دے کر غیر اہم بنا دیا ہے اس لئے ہماری نسل نو میں خود اعتمادی، بہادری، سچائی اور قیادت کا فقدان ہے، جس سے جھوٹ، خوف اور موقع پرستی کو فروغ ملا اور ہم اجتماعی طور پر منافقین کی فوج کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ آج بھی وقت ہے کہ ہم اپنے انفرادی واجتماعی رویوں میں احتساب کا عمل اپنا کر ایسی تبدیلی لائیں کہ جس کے بعد ہمارے بچے ہماری بہتری کی بنیاد ہوں کیونکہ اگر ہم نے بچوں کی اہمیت تسلیم کر کے ان کی تعلیم وتربیت پر توجہ نہ دی تو امکانی حالات سے مقابلہ کرنے کے بجائے ہماری نسلِ نو موقع پرستی کا شکار ہوتی رہے گی۔ اس لئے قومی وقار اور بہتر مستقبل کیلئے ضروری ہے کہ ہم بچوں کے حقوق کی حفاظت کر کے انہیں ایسا ماحول مہیا کریں کہ قوم کا مستقبل محفوظ ہو جائے۔ ورنہ یاد رکھیں کہ محروم، محکوم اور کمزور معماروں سے قومی مستقبل بھی غیر محفوظ ہو جاتا ہے۔

(4 دسمبر، 2008ء)

ترے فراق میں!

عابد میر

انقلاب میں اور کسی بھی ملکہ حسن میں کئی باتیں مشترک ہوتی ہیں۔دونوں کے لاکھوں ،کروڑوں عاشق پائے جاتے ہیں جوان کی ایک جھلک کے لئے جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔دونوں،انسان کوخواب دکھاتے ہیں' خواب جو جینے کی آرزو جگاتے ہیں' خواب جو جستجو، لگن اور جدوجہد پہ اکساتے ہیں۔ان دونوں کی مارکیٹ ویلیو میں کبھی کمی نہیں آتی۔دونوں کے معیار سخت اور کڑے ہوتے ہیں۔لیکن حرص کی ماری منحوس سرمایہ داری نے جیسے محض اپنے منافع کے لئے قدرت کے عطا کردہ حسن کو مارکیٹ ایبل آئیٹم بنا دیا،اسی طرح کمال ہشیاری سے انقلاب کو بھی ایک کمانڈیٹی میں بدل دیا۔حسن اب قدرتی نہیں رہا، پچاس روپے کی ایک کریم کسی بھی لڑکی کو مارکیٹ کے معیار کے مطابق حسین بنا سکتی ہے۔اسی طرح انقلاب اب عوامی نہیں رہے،انہیں اب درآمد اور برآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔تبدیلی کا جھنڈا اب 'نان گورنمینٹل آرگنائیزیشنز' کے ہاتھ میں ہے' جو بیک وقت نان پارافٹ ایبل، نان پولیٹیکل ، نان آئیڈیالاجیکل ، نان پبلیکل ، نان مارل (Moral)ہوتی ہیں۔کسی زمانے میں جیسے ہندوستان نے اپنی فلم انڈسٹری کی مقبولیت کی بنا پر دعویٰ کیا تھا کہ اس نے اپنے ثقافتی اثرات اب پاکستان کے ہر گھر میں داخل کر دیے ہیں،عین اسی طرح یہ این جی اوز عالمی سامراج اور اس کے سامراجی اداروں کا وہ آلہ(بلکہ آلہ کار) ہیں جن کے ذریعے یہ ہمارے گھروں تک گھس آئے ہیں' ان کے شر سے کوئی نفر،کوئی گھر،کوئی گھرانہ محفوظ نہیں۔

ایسے میں اپنی فکر، اپنا نظریہ، اپنا ایمان بچائے رکھنا گویا پل صراط پہ چلنے کے مترادف ہے۔ جوان مرگ خورشید مستوئی اس قافلے کے چند ایک بچ جانے والے ایسے ہی اہلِ ایماں میں سے تھے۔

بلوچستان کے خاص الخاص سرائیکی بیلٹ بھاگ ناڑی سے ملحق تحصیل تمبو میں، علم کا دروازہ کہلائے جانے والے 'علی' کے نام سے نسبت رکھنے والے، تمام تر بنیادی ضروریات سے محروم معمولی قصبہ 'علی آباد' میں جنمے اس روشن دماغ آدمی کے بدن پر بیماریوں کے حملے اس کی پیدائش سے ہی شروع ہو چکے تھے۔ اس کی بیماری نے ہی اس کے خاندان کو تب، ناڑی کے لحاظ سے سب سے قریبی بڑے مرکز جیکب آباد ہجرت کروائی۔ جیکب آباد ہی وہ نقطہ ہے جہاں سے بلوچستان کی جدید سیاسی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ جی ہاں، لندن میں جلاوطنی کے دوران 'داس کیپیٹل' کو اپنے سرہانے رکھ کر سونے والے ہمارے قومی اکابر یوسف عزیز مگسی نے اپنے رفقا کے ساتھ پہلی کل ہند بلوچ کانفرنس اسی جیکب آباد میں منعقد کروائی۔ آج بھی جسے جدید بلوچ سیاست کو سنگِ میل سمجھا جاتا ہے۔ فطرت نے ہمارے خاندانی اکابر اور ساتھی خورشید مستوئی کی سیاسی تربیت کے لئے اسی بلوچ مرکز ے کا انتخاب کیا۔

خورشید مستوئی کا جنم ایک محنت کش گھرانے میں ہوا۔ ہاری گھرانہ، مزدور گھرانہ...... وہی مزدور کسان جس کے خون پسینے کی کمائی پر صدیوں سے جاگیردار اور اس کا خاندان اپنی توندیں اور تجوریاں بھرتا چلا آیا تھا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء کی پیدائش رکھنے والے خورشید مستوئی کا عہدِ بلوغت دنیا میں محنت کرنے والوں اور محنت کا استحصال کرنے والوں کی واضح تقسیم کا زمانہ تھا۔ اس لئے بھی اس پرولتاری کو اپنے طبقاتی شعور اور آگہی کے حصول میں دیر نہ لگی۔ محنت کشوں اور جاگیرداروں کی سرپرستی کرنے والی دو عالمی طاقتوں کی سرد جنگ عروج پر تھی۔ اچھائی برائی، نیک و بد، برے بھلے، کمانے وکھانے والے اور ظالم ومظلوم کی لکیر واضح تھی۔ دوسروں کی محنت پر اپنی توندیں اور تجوریاں بھرنے والے سارے دائیں طرف تھے، اور محنت کرنے والے، کھردرے ہاتھوں، جفاکش چہرے والے سبھی نیک انسان بائیں طرف۔ ان دو اطراف کے بیچ غیر جانبداری کی منافقت کا قلعہ ابھی تعمیر نہ ہوا تھا۔ ایک مزدور کے بیٹے کی سمت بائیں طرف ہی ہو سکتی تھی۔ سو وہ لیفٹسٹ کہلایا۔

تب دنیا بھر کے لیفٹسٹ اپنے قبلہ و کعبہ کو بچانے کی تگ و دو میں جُتے ہوئے تھے، بدی کی قوتوں نے جس کا گھیرا تنگ کر رکھا تھا، اور اسے مٹانے کے درپے تھیں۔ کامریڈوں کی نیندیں حرام کر دی گئی تھیں، زمین ان پر تنگ تھی، غداری اور کفر کے فتوؤں کی بھرمار تھی۔ کمروں، دیواروں اور ٹیبلوں کے پیچھے چھپ چھپ کر یہ دیوانے اپنے خواب کو بچانے کے جتن کرتے تھے۔ تب بھی چوتھی کلاس کا طالب علم، ڈھائی فٹ کا خورشید مستوئی، روسٹروم کے سامنے اسٹول پہ کھڑے ہو کر بڑے بھائی کی لکھی ہوئی تقریریں پڑھتا، نظمیں گنگناتا، انقلاب کے گیت گاتا رہا۔ اس کی قائدانہ صلاحیتیں تو تبھی بیدار ہونا شروع ہوگئیں جب محض دس، بارہ برس کی عمر میں وہ بچوں کی پروگریسو تنظیم 'ساتھی بارڑا سنگت' کا دوبار بنا مقابلہ مرکزی چیئرمین منتخب ہوا۔ یہاں سے فارغ ہوتے ہی ڈی ایس ایف کی سرگرمیاں...... لیکن ابھی فضا میں انقلاب کے نعروں کی گونج نہ تھمی کہ محبوبہ جیسی سوویت یونین کی موت کی خبر آگئی...... ہمیشہ کی طرح وقتی طور پر بدی کی قوتیں حاوی آگئیں' نیکی کی موت ہوئی' خلوص' اچھائی' سچائی' دیانت داری' وفاداری اور وہ بھی بشرطِ استواری، ان تمام کائناتی جذبوں کی آبیاری کرنے والے سوویت کے ساتھ ہی ان کا بھی انہدام ہوگیا۔ پوری دنیا کے لئے انقلاب کے نعروں کی جگہ اب صرف اپنے محلے کی روڈ نالی کی تعمیر کے نعرے نے لے لی۔ حتیٰ کہ یہ وقت بھی آیا کہ روٹی، کپڑا اور مکان کا اجتماعی مطالبہ 'وطن کارڈ کھپے' کے انفرادی نعروں میں تحلیل ہوگیا۔ ایسے جان لیوا صدمات سے کون سچا، معصوم کارکن جانبر ہوسکتا ہے...... سو خورشید مستوئی بھی چلا گیا' اب محض لفاظی کرنے اور تقریریں جھاڑنے والے ہم جیسے بے خواب، بے سمت لوگ ہی باقی رہ گئے ہیں۔

جن حرماں نصیبوں کا انقلاب ناکام ہو جائے ان کا عشق کہاں کامیاب ہوسکتا ہے۔ سو معروف معنوں میں، دنیا بھر کے انقلابیوں کی طرح خورشید مستوئی کے انقلاب کی طرح ان کا عشق بھی ناکام ہوا۔ نوکریاں بھی ناکام ہوئیں۔ مشن بھی ناتمام رہے۔ اور آخر، عمر بھی ناتمام ثابت ہوئی۔ سوویت کا خواب ٹوٹا تو کیفی صاحب کے بقول لاکھوں کروڑوں عاشقوں کے سجدے آوارہ ہوگئے۔ کچھ نے سمت بدل لی تو بعض اہلِ روزگار انقلاب کو کمانڈیٹی بنا کر گزر بسر کرتے رہے۔ خورشید مستوئی جیسے اہلِ ایماں نوجوان بے سمت رہے۔ ٹنڈو جام یونیورسٹی سے پانچ برس کی

محنتِ شاقہ سے حاصل کی گئی بی ایس سی آنرز کی ڈگری بے سود ہو کر رہ گئی۔ایمان بچانے کے لئے تحریر میں پناہ ڈھونڈی۔ وہیں حیدرآباد میں سندھی اخبارات سے منسلک ہوئے۔کہیں چین نہ پایا۔ جعفرآباد لوٹ آئے ۔ اپنا ہفت روزہ اخبار شروع کیا۔ جاگیرداروں اور ان کے پٹھوؤں سے منہ کی کھائی۔ہم نالائقوں سمیت سبھی یار دوستوں نے بھی دشنام کیا۔اس پسپائی کا زخم بھلانے کراچی کی میٹرو پولیٹن کائنات میں لوٹ گئے۔سرکاری نوکری کی، نہ جم سکے۔سندھی ٹی وی چینلز سے یاری رکھی، نہ نبھ سکی۔ وہاں سے سیدھے کوئٹہ آ گئے۔وہی اخبار، وہی لکھنا پڑھنا۔اندر کی بے چینی مگر کہاں تھمتی۔کوئی راہ نہ پا کر اسی مرکزے کی طرف لوٹے، جہاں سے چلے تھے۔ہم سب کا سیاسی مرکز' یوسف عزیز کی کل ہند بلوچ کانفرنس والا' وہی جیکب آباد۔یہیں جوانی کے کچھ نظریاتی دوستوں کے اکٹھ میں آئے تو کچھ سنبھالا ملا۔کچھ تسلی کہ اب بھی 'پنے ایماں کے کچھ ساتھی باقی ہیں ۔پیاسے کو کنواں نظر آیا۔زخمی کو شفاخانہ مل گیا۔پر یہ ہم آپ کی طرح انفرادیت کا مارا عام پیاسا تھوڑی تھا کہ خود سیر ہو کے بیٹھ جاتا اور اپنی آئندہ نسلوں کے لئے ذخیرہ کرتا، نہ یہ عام سپاہی کے جسے محض اپنے زخموں کی شفایابی مطلوب ہو۔ یہ تو 'سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' کے قافلے والا جوان تھا 'سو اردگرد کے سارے جہاں کی پیاس بجھانے میں جُت گیا۔سب کے زخموں کی شفایابی میں لگ گیا۔بظاہر یہ سماجی تنظیم ہے جس سے وہ آخر میں منسلک تھا،لیکن سامراجی اداروں کی پروردہ سماجی تنظیموں کی طرح ،عوام کو سیاست سے متنفر کرنے اور محض روڈ نالی بنانے والی تنظیم نہیں ۔نہ صرف سیاسی عمل بلکہ سیاسی تربیت کو تنظیم کا بنیادی ہدف قرار دینے والوں کا اکٹھ۔بہت دیر سے لیکن یہ دوست اس درست نتیجے پر پہنچے کہ دشمن کو اس کے ہتھیار سے شکست دینا، انقلابی جنگ کی حکمتِ عملی کا ہی حصہ ہے' شرط صرف اپنے ایمان کو پراگندہ ہونے سے بچائے رکھنا ہے......اور گھر میں گھسے ہوئے اور اسی کی تنخواہ سے گھر چلاتے ہوئے یہ کس طرح ممکن ہے' خورشید مستوئی جاتے جاتے اپنے فکروعمل سے دوستوں کی یہ تربیت ضرور کر گئے ہوں گے۔

مسلسل لکھتے پڑھتے رہنے' سیاسی جلسے جلوسوں کے انعقاد' سیمینار' کانفرنسوں اور گپ شپ سے لے کر، ایک لمحے کو نچلا نہ بیٹھنے والے اس شخص نے بسترِ مرگ پر بھی کوئی لمحہ ضائع کئے بنا

مسلسل کام کیا۔ مسلسل تربیت کی۔ اہلِ خرد کو اکثر ان سے اختلاف رہا۔ وہ خود بھی زمانہ سازوں کی منطق سے کبھی متفق نہ ہوئے۔ مصری ادیب علاء الاسوانی کے بقول: ''جنونیوں کی یقیناً اپنی ایک منطق ہوتی ہوگی، لیکن ہم اس سے واقف نہیں ہوتے، کیونکہ جس لمحے وہ ہم سے مختلف رویہ اختیار کرتے ہیں، ان سے ہمارا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔'' بے پناہ محبت کے باوجود ہم بھی اکثر اختلافات کا شکار رہے۔ مختلف رویہ اختیار کرنے کے باعث اکثر ہمارا رابطہ منقطع رہا۔ نظریاتی عمل داری پر ہمارا نقطہ نظر مختلف رہا۔ وہ عملی سپاہی تھے، ہم الفاظ کے گھوڑے دوڑانے والے۔ وہ اپنی ناکامیاں تسلیم کرتے تھے، ہم اپنی ناکامیوں پہ اِترانے والے۔ وہ عوام سے انقلاب کی جستجو رکھتے تھے، ہم کتابوں میں انقلاب ڈھونڈنے والے۔ وہ اپنائیت میں عاجزی پر یقین رکھتے تھے، ہم نام نہاد خود داری کے مارے ہوئے۔ وہ انقلابی تھے، ہم محض خطابی۔ وہ عمل کرتے تھے، ہم محض نقل کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو جیتے تھے، ہم محض اسے گزارتے ہیں۔ وہ کھل کر ہنسنے کا یارا رکھتے تھے، ہم کھل کر رو نہیں پاتے۔ وہ سچ کہتے تھے، ہم سچ سننے سے بھی عاری۔ وہ اچھے تھے، ہم محض اچھا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں...... ہم ان جیسا نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں ان جیسا نظر آنا چاہیے، ہمیں ان جیسا بننا چاہیے۔ ہر اچھے انقلابی کو ان جیسا ہونا چاہیے۔ اپنی تشنگی کو بھول کر دوسروں کی پیاس بجھانے والا، اپنے زخم چھپا کر دوسروں کے زخموں پہ مرہم لگانے والا، خواب دکھانے والا، خواب کی تعبیر کی جستجو پر اکسانے والا!!

ہم نے اپنے قافلے کا ایک اکابر ساتھی وقت سے پہلے کھو دیا ہے، صد شکر کہ اس کے افکار، اس کا رستہ، اس کی سمت، اس کا قافلہ، اس کا عمل نہیں کھوئے۔ منزل کی جانب انہی سے ہم رہنمائی حاصل کریں گے، منزل کی جانب یہی ہماری رہنمائی کریں گے۔ اور اسی قافلے کے ایک انقلابی، فیض کے بقول......

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے!

کامریڈ خورشید مستوئی 15 اپریل 1974ء کو بلوچستان کے نصیر آباد ڈویژن کے ایک دور افتادہ قصبہ علی آباد، تحصیل تمبو میں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں اُن کا خاندان جیکب آباد ہجرت کر گیا۔ انٹر تک انہوں نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ بی ایس سی آنرز کی ڈگری، زرعی یونیورسٹی ٹنڈو جام سے حاصل کی۔ ان کا خاندان سرخ سیاست سے وابستہ رہا، یوں ترقی پسند، روشن خیال اور وطن دوست سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی بچپن میں جب پرائمری کے طالب علم تھے، سندھ سطح پر بچوں کی قائم کی گئی روشن خیال تنظیم ساتھی بارڑا سنگت کے دو بار بلا مقابلہ مرکزی چیئرمین منتخب ہوئے۔ بعد ازاں ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان سے وابستہ رہے۔ قلم سے بھی اُن کا تعلق بچپن سے ہی قائم رہا۔ پروفیشنل جرنلزم کا آغاز حیدر آباد میں دورانِ تعلیم سندھی اخبارات سے کیا۔ اس دوران روزنامہ کاوش، کوشش، ہلچل، سندھ، نوں نج، سوبھ، وغیرہ میں بطور سب ایڈیٹر و ایڈیٹر کام کیا۔ کچھ عرصہ سندھی ٹی وی چینل کے ٹی این سے بطور اسکرپٹ ایڈیٹر، اور دھرتی ٹی وی سے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کرنٹ افیئرز وابستہ رہے۔ 2005ء میں جعفر آباد سے 'تعبیرِ بلوچستان' کے نام سے ایک ہفت روزہ بھی نکالا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ کوئٹہ میں روزنامہ 'آساپ' سے وابستگی کے دوران بلوچ مسئلے پر درجنوں کالم لکھے۔ زیرِ نظر مجموعہ، ان کے انہی مضامین کا ایک مختصر سا انتخاب ہے۔

کامریڈ خورشید مستوئی 2 اپریل 2011ء کو کینسر کے باعث محض 37 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

Mehrdar Institute of Research & Publication
P.O.Box No.26 Quetta Balochistan
E-mail: mehirdar@gmail.com

 Rs: 150/=